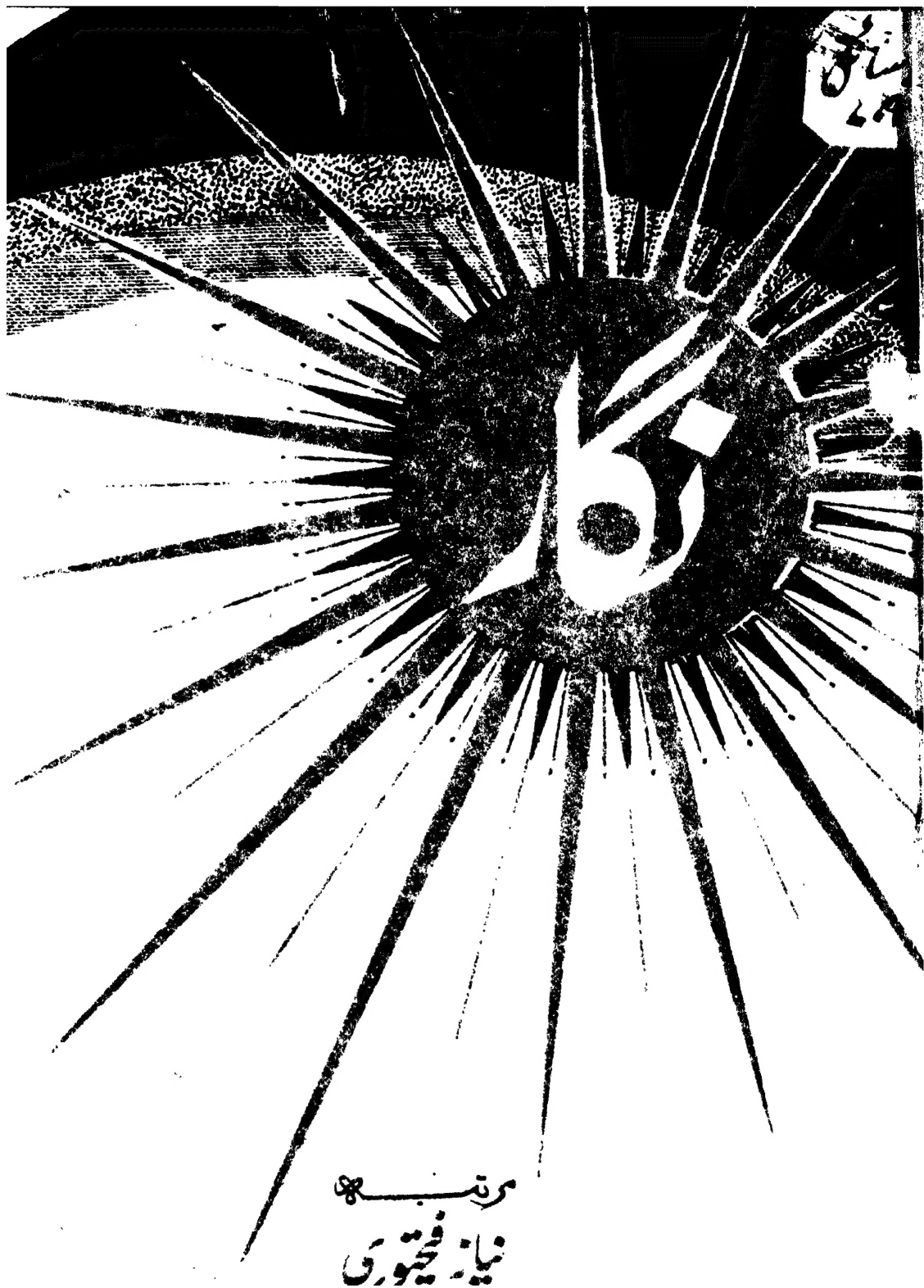


U: 7194



5-15-67

رسالہ: مہینے کی بندہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے۔

رسالہ نہ ہو بخفی کی صورت میں میں تیار تک و فخر کو اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا۔ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے۔ جس پر نہ خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔ جواب غلبہ امر کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ نامہ ضروری ہے۔

مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئے

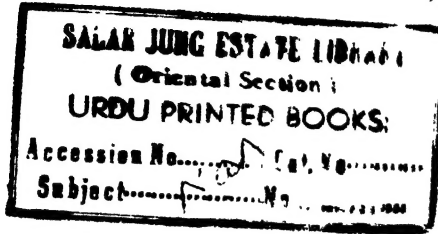
مضامین صاف اور فخر محفل آنے چاہئے
سالانہ قیمت: پانچ روپیہ، ہفت روزہ قیمت: دو روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

تقدیم یافتہ ایسے فنکاروں کی فہرست	تقدیم یافتہ ایسے فنکاروں کی فہرست	تقدیم یافتہ ایسے فنکاروں کی فہرست
تین تا ۲۵ روپے ۲۲ روپے ۱۳ روپے	۱۱ اجرت سال کی پیشگی فائزوری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے تازہ شہنشاہی کے ان کوئین فیصدی کمیشن، اجائی کا سیما دہشتہ اندر روپے قبل اطلاع دینے پر ضمنی بدل میں ہے۔	۱۰۰ روپے ۶۰ روپے ۴۰ روپے
ایک سو ۱۲ روپے ۹ روپے ۶ روپے		۲۰ روپے ۱۵ روپے ۱۰ روپے

مجلس

۸۸	پیری دنیا	۸۸	مضامین عالمگیر	۸۸	علم الکلام	۸۸	پیر دنا
۸۸	کالیپاٹ	۸۸	غناز اسلام	۸۸	الکلام	۸۸	پیر دنا
۸۸	میٹھی جھری	۸۸	کلیات خدی شمس	۸۸	رسائل شبلی	۸۸	دوم
۸۸	طرحدار لونڈی	۸۸	کلام شاردورد	۸۸	مقالات شبلی	۸۸	سوم
۸۸	طلسی فانوس	۸۸	الف لیله بلر ناول	۸۸	شوالیم جلد اول	۸۸	افاردق
۸۸	پرتختا ویر	۸۸	کاسنی	۸۸	دوم	۸۸	سیرۃ النعمان
۸۸	مرنائی	۸۸	سولخ عمر و یار	۸۸	سوم	۸۸	الغزالی
۸۸	مار استین	۸۸	مشتی	۸۸	چهارم	۸۸	المامون
۸۸	بگلی دولین	۸۸	احسن الذی	۸۸	پنجم	۸۸	سولخ مراد دم
۸۸	معشور و رنگ	۸۸	حاجی بنگول	۸۸	کلیات امیر بنائی	۸۸	سفر و شام

بسم اللہ



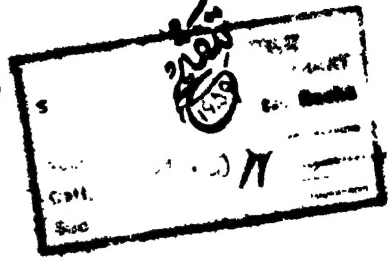
نگار

فہرست مضامین ماہ مارچ ۱۹۳۳ء

ملاحظات	۲	باب الاستفسار	۸۶
شیخ محمد حزمین - عبدالملک آردی	۹	محبت کا ایک لمحہ (نظم) حافظ غازی پوری	۹۲
مصور کا ناتمام شاہکار (فسانہ مظفر قزلباشی)	۳۸	پیام (نظم) جمیل منطری کاظمی	۹۳
کیا مسلمانوں کے عقاید اسلامی ہیں - سید مقبول احمدی	۴۳	میموریل گارڈن کلکتہ (نظم) اختر شیرانی	۹۴
مراق (فسانہ) رفیعہ اجیری	۴۸	غزلیات :-	
مومن و کلام مومن - کیفی چربا کوٹی	۵۷	افسر امروہوی	۹۵
انتظار (فسانہ) محشر عابدی	۶۵	نظیر لودھیانوی، شاقب جالندھری	۹۶
حکومت برطانیہ کی وسعت کاراز - عبدالقیوم رسا	۷۷	رباعیات :- فراق گور کھپوری	۹۶

بسم اللہ

مکار



اڈیسر: نیاز فتحپوری

شمار (۳)

مارچ ۱۹۳۰ء

جلد (۱۷)

ملاحظات

خدا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب سوچ کے طلوع و غروب سے انگو چاند کے ایاب و ذباب سے پوچھو، آبشار و ن کی روانی دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو، پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔ موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل بہار و خزان کا ظہور و خفا نباتات کی پوک و نمونی، وحوش و طیور کی طبعی نیمرنگی، نوع انسانی کے قوانے کا منہ، فضا کے بیسٹ کے تارے کائنات کی لامناہیت و وسعت، خورشید و شبنم، ذرہ و آفتاب اور ان سے بھی فرد تر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں، (جن کا نام ہم نے علم طبقات الارض، علم الجرم، علم الافلاک، علم الکیما، علم وظائف الاعضا، علم الحیات، نفسیات و غیرہ رکھا ہے) بتائیں گی کہ کوئی ایسی قوت ہے جس کے سمجھنے کے لئے ہم اپنی عقل کو عاجز و بے بس پاتے ہیں اور اسی لئے یہ مسئلہ اس قدر پیہی اس درجہ روشن و واضح ہے کہ اگر چاہوں تو اسے مشاہدہ سے تعبیر کر سکتا ہوں جس کے لئے نہ دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی حجت و توجیہ کی۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے آگاہ ہو جاتا ہے، صبح کو بھول کھلتے ہیں اور سارا کچھ نکلت سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی برہان ہے، یہ وہ صداقت ہے جو آپ اپنی مصدق ہے۔ اگر ہم اس سے نادانق ہیں تو کس کا قصور؟

حق خامش ست و باتو بصد رنگ گفتگو ست
موقوف اضطراب زمان نیست عرض راز
ہر گہ نظر خطاب کند حرف خامشی ست
کثرت حجاب جلوہ وحدت نمی شود
بہر اب اور نہ کبھی، یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوا کہ کوئی قوت مافوق الادراک ہے یا نہیں البتہ عقول انسانی کا خلا
اس امر میں ضرور ہوا ہے کہ ہم اس کا تصور کیونکر کریں، اُس نہ دیکھے جاسکتے والے کو کیونکر دیکھیں اور اُس نہ سمجھے جاسکتے
والے کو کس طرح سمجھیں فلسفہ آج تک اس گرہ کو نہ کھول سکا اور مذہب کی عقیدہ کشانیانِ تمامتر اسی ایک جہ سے وابستہ رہیں
اور مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء و رسل نے مختلف طریقوں سے اسی مسئلہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، لیکن کیا یہ امر حیرانگ
نہیں ہے کہ باوجود اس کے کہ حقیقت ایک ہے، مگر تعبیرات بشمار، راز ایک ہے مگر اس کی داستانیں کثیر، اور
حُسنک واحد و عیالنا شتی

جنگ ہفتاد و دو ملت ہم را عذر نہ
چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند
مذہب و مذہب، اقوام و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کفر و اسلام، اذان و ناقوس کی وہ جنگ جو آج
نظر آ رہی ہے، کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کی ابتدا اُسی وقت سے ہوتی ہے جب سے انسان اپنی فطرت کے ساتھ جذبہ تفوق پرستی
لیکر آیا ہے، یقیناً یہ جنگ علم و مذہب کی جنگ نہیں، کیونکہ اگر مذہب کا مقصود اعلیٰ صرف خدا شناسی ہے تو پھر مجھے کوئی شبہ
کہ دنیا کا وہ کونسا علم ہے، جو مٹا اس غایت تک نہیں پہنچتا، نہیں، بلکہ یہ جنگ اُن رقیبوں کی تھی جو ایک ہی محبوب کے
جلوہ کے لئے بیتاب تھے، اُن جاننا دکان خود فراموش کی تھی جو سو اے اپنے کسی اور کو ”خلوتیان راز“ میں شامل دیکھنا پسند
نہ کرتے تھے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ اپنے ہی ”ذوقِ سجود“ کے تفوق کو ثابت کر کے ”آستانِ محبوب“ کو اپنے لئے مخصوص
کر لینا چاہتے تھے۔ یقیناً یہ کمزوری کم و بیش ہر زمانہ کے انسان میں پائی گئی ہے اور آج بھی تمام افتراق و انشقاق اسی کمزوری
کا نتیجہ ہے

فلسفہ استدلال کی دنیا میں اگر جس وقت اس مسئلہ پر غور کیا جائیگا تو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل سبب صرف
یہ ہے کہ خدا کے جس تصور کو مذہب عالم نے پیش کیا وہ صحیح نہ تھا ممکن ہے کہ صرف قومی و ملکی نظام تمدن کے لحاظ سے اُس وقت
مناسب رہا ہو لیکن اخوتِ عامہ اور ہمہ گیری کے لحاظ سے وہ نامکمل تھا، دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ایسا ہوا ہے
جس نے ہزاروں لاکھوں سال کی اس لکھی ہوئی گتھی کو سلجھا یا اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اب نہ مذہب کے لحاظ سے کسی اور مذہب
کی ضرورت دنیا کو باقی ہے نہ مبلغ مذہب کی حیثیت سے کسی اور ہستی کے رونا ہونے کی حاجت۔ اور وہ مذہب اسلام ہے
جو نہ کسی ملک کے لئے مخصوص ہے نہ کسی قوم کے لئے مختص، اس کی دعوت گہر و ترسا، یہود و نصاریٰ، عالم و جاہل، امیر و فقیر

شاہ وگد اشرق و مغرب، شمال و جنوب ہر طبقہ و ہر ملک کے لئے یکساں ہے اور اسی لئے اس نے جو مفہوم خدا کی کبریائی کا پیش کیا ہے وہ ایسا جامع، ایسا قرین عقل، ایسا ہمہ گیر اور سدرجہ وسیع ہے کہ جس آسانی سے ایک جاہل اُسے قبول کر سکتا ہے بالکل اسی طرح ایک فلسفی بھی اس کے ماننے پر مجبور ہے

وہ زمانہ جب آسانی بادشاہت کا وعظ دیکر خدا کو ایک دنیاوی صاحب جبروت بادشاہ کی طرح پیش کیا جاتا تھا، ختم ہو گیا، وہ عہد جب عقول انسانی صرف مرئی و محسوس اشیاء پر ایمان لاسکتے تھے اور جب ضرورتاً و مصلحتاً مسیح کو خدا کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تھی، گزر گیا، وہ دور انسانیت جب تمرکز نفس (منہمکہ نفس) کے لئے رمزی و اشاری (Symbolic) طریق عبادت کی ضرورت محسوس کر کے خدا کے وجود کو بیٹوں، ہمیلٹون، متالون اور مجسموں میں تبدیل کیا گیا، باقی نہیں ہے۔ یہ تمام زمانے اب سے تقریباً ۱۳۵۰ سال قبل ختم ہو گئے، جب ریگستان عرب سے ایک انسان کامل و اکمل کا ظہور ہوا اور اسے نہایت ہی مختصر و سادہ الفاظ میں خدا کے وجود کا وہ فلسفہ بیان کیا جو اس سے قبل کسی نے بیان نہ کیا تھا۔ اسے تنوید و تثلیث کی تردید کی، اسے تجسیم و تشکیل کو غلط ٹھہرایا اسے حلول و تنفید کی تخلیط کی، اسے تشتت و انتشار کی صورتوں کو محو کیا، تفریق و افتراق کی راہوں کو بند کیا اور اسے بتایا کہ خدا تمام مکانات و زمانیات کے تعلق سے بے نیاز ہے، مادیات کی دنیا سے علیحدہ ہے اور تمام ان نسبتوں و اضافتوں سے منترہ جو عقول انسانی کو کسی وجود کے سمجھانے کے لئے متعین کی جاتی ہیں۔

ایک طرف تو اسے بتایا کہ اس کا قیام عرش برین پر ہے یعنی ذات انسانی سے علیحدہ کائنات میں، فضائے وسیع میں، جو لامتناہی میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور دوسری طرف اُسکو شہ رگ سے زیادہ قریب بتایا یعنی جس حد تک ذات انسانی کا تعلق ہے، اُس کے قرب کی کوئی انتہا نہیں وہ سانس میں جاری ہے، خون میں ساری ہے، روح میں دوڑ رہا ہے، قلب میں جاگزیں ہے

اس کو رحمان و رحیم بتایا، اور جبار و قہار ظاہر کیا بظاہر یہ نام ایک دوسرے کی ضد ہیں، لیکن یہ میں سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جن کو اسماء حسنی کہا جاتا ہے وہ نہ خدا کے ذاتی نام ہیں نہ صفاتی بلکہ آثار ہی و مظاہر ہی اسماء ہیں جن کا تعلق کائنات کے ہر تغیر و تبدل، زندگی کے تمام اصول اور ہستی کے جملہ اعتبارات و امتیازات سے ہے۔ یعنی اگر انسان خوشحال و پر امن زندگی بسر کر رہا ہے تو یہ بھی اُسی کا مظہر ہے، اور اگر قہر و جبر کی ساعتیں گزار رہا ہے تو یہی یہ اُسی ایک ذات کی وجہ سے نہیں، جس نے ایجاب و علل کو پیدا کر کے عالم کی تمام کیفیات مادی و ذہنی کو اپنے سے منسوب کیا ہے اور جن کے اختیار کرنے اور انھیں کے مطابق نتائج حاصل کرنے کے لئے انسان کو عقل کامل عطا فرمائی ہے۔

یہ تھا خدا کا وہ تصور جو بانی اسلام نے بتایا اور دعویٰ کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے زیادہ پاکیزہ و منترہ خیال جو بالغ ترین نگاہ اور سائرین فکر انسانی کے لئے بھی قابل قبول ہو، اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے وہ اصل اصول مذہب

جو انسان کو وسیع النظر بناتا ہے جو تمام افراد کو ایک رشتہ اخوت سے وابستہ کرتا ہے اور جو دلوں کو نصب و جبل، کینہ و بغض سے پاک کرتا ہے، لیکن کیا کوئی مسلمان آج کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا کو ایسا ہی سمجھ رہا ہے جیسا بانی اسلام نے سمجھا یا تھا اور اس کی آغوش ہر انسان کے لئے خواہ وہ کسی مذہب و ملت، کسی ملک و قوم کا ہو پوری طرح کھلی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ طبقہ صوفیہ بھی جن کے مشرب و مسلک کا انحصار ہی عقیدہ ”وحدت وجود“ پر ہے کوئی کیفیت، نئے ذہن و ضمیر میں اس نوع کی نہیں پاتے جو اس اعتقاد کے بعد پیدا ہونی چاہئے

ہمارے یہاں کے علماء و مقدس جو اپنی ساری زندگی صرف روزہ و نماز کی تلقین میں بسر کر دیتے ہیں کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی غور نہیں کرتے کہ جس خدا کا پیام وہ دنیا کو پہنچا رہے ہیں وہ پہلے روزہ و نماز کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس تعلق کی تصدیق چاہتا ہے جو اس کے اور بندوں کے درمیان قائم ہے اور جس کے سمجھنے پر کائنات کی ترقی، روح کا استعلاء، اخلاق کی پاکیزگی، مادی ارتقاء اور عالم کا امن و سکون منحصر ہے۔ اگر ایک مسلمان نماز پڑھنے کے بعد مٹی سے یہ خیال لیکر نکلتا ہے کہ مندر و کلیسا خدا کی حکومت سے علیحدہ ہے، اگر وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر اپنے سوا تمام عالم کو غیر خدا کی پیداوار جانتا ہے تو، مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم!

پھر جب خدا سب کا ہے، تمام مخلوق اسی کی ہے، اس کو نہ مذہب سے فائدہ پہنچتا ہے نہ لازمہ ہمتیت سے نقصان تو پھر یہ عصمت کیوں، یہ تفوق و برتری کا غلط معیار کیسا، طریق عبادت کے اختلاف پر جنگ کیا معنی، وضع و لباس کی تفریق، تمدن و معاشرت کے امتیاز پر آویزش کیسی؟

دل چو آزاد از تعلق شد منور می شود قطرہ کز موج دامن چید گوہر می شود
ہیچکس را در محبت شرم ہیچشمی مباد در ہوایت ہر کہر گرید ویدہ ام ترمی شود

”انسانیت، اب نہیں بلکہ ایام طفولت ہی سے حسن و جمال کا خواب دیکھ رہی ہے، اور جس حد تک اس کا علم، اس کے مشاعر بڑھتے جاتے ہیں، اسے قدر زیادہ شدت و تنوع کے ساتھ یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب فن اپنے فن میں، ایک شاعر اپنے شعر میں، ایک ادیب اپنی انشاء میں، ایک فیلسوف اپنے فلسفہ میں یا شاعر کہ ایک مادہ پرست بھی (جو اپنی فطرت کے لحاظ سے معنی جمال سمجھنے کا بہت زیادہ نااہل ہے) حسن ہی کا خواب دیکھتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جمال کسے کہتے ہیں؟

جمال ایک خیال ہے جو مادہ کے لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ ایک تبسم ہے جو عالم انسانیت کی پیشانی پر نمودار ہوتا ہے۔ وہ صحرا و حیات میں تھک جانے والے تمدن کی جائے پناہ ہے۔ وہ ایک قوت ہے جو مادہ کی قیود سے عین آزاد کرتی ہے۔ وہ حیات سے زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے جو حیات کو بھی بھلا دیتی ہے۔

مان اپنی لڑکی کے سہرے بالوں کے چھلون کو دیکھ کر فطرت سے مسکرا پڑتی ہے اور لڑکی بھی ہنس دیتی ہے شاعر دیکھتا ہے اور ان دونوں کی ہنسی میں وہ جمال الہی کی چمک محسوس کرتا ہے۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کے چہرہ پر نگاہ ڈال کر اپنے قلب کو سکون سے بھر لیتا ہے۔ ایک شخص شام کے وقت آسمان کی رنگین فضا کو دیکھ کر، آفتاب کو افاقہ لگاتے ہیں غروب ہوتے ہوئے دیکھ کر جمال فطرت سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک شاعر، ایک مغنی حسن سے متاثر ہو کر، اپنی موسیقی کے بازوؤں سے فضا میں اس تاثر کو پھیلا دیتا ہے، پھر اگر اس کا نغمہ عظمت وطن سے متعلق ہے تو وہ اپنے نفس کو وطن کے ہیکل مقدس پر قربان کرتا ہوا محسوس کرتا ہے اور اگر وہ نغمہ محبت ہے تو ہر آواز کے ساتھ وہ اپنی روح کے اجزاء کو صرف ہوتے ہوئے دیکھتا ہے

تاردر (رحمۃ اللہ علیہ) اپنی کتاب ”النطق الاجتماعي“ (رحمۃ اللہ علیہ) میں لکھتا ہے: ”ہم وطن کو جیل کہتے ہیں جب وہ قوی ہوتا ہے۔ ہم اسے عظیم کہتے ہیں جب اُس کے افراد مہذب و شایستہ ہوتے ہیں“۔ یقیناً جیل ہے وہ وطن جو ظلم کے سامنے نہیں جھکتا اور جو لوہا حضرات بلند کرنا اپنا نصب العین قرار دیتا ہے

اسپارٹا حسین تھا جب اسپارٹا کا رہنے والا دیکھتا تھا کہ اُس کا ملک بلاد یونان پر حکمران ہے۔ مصر قدیم جیل تھا جب اہل مصر اپنے ملک کی عظمت کے معتقد تھے اور وہاں کے ہیاکل و آثار میں وہ انوار ربانی کی روشنی کو مرکوز پاتے تھے۔ روم جیل تھا۔ رومی نے اپنی ملک کو تمام بلاد عالم کی ملکہ جانتا تھا۔ جو عرب جیل تھے جب اسلام اس کے فرزندوں کو حضرات و مدنیت سے آراستہ کر رہا تھا اور اس کی شوکت و بھرتی کی داستانیں دنیا کے ہر گوشہ میں جُنی جاتی تھیں یہ خیالات ایک مصری ادیب کے جن میں ملت میں ہوئے تھے وہ جاکہ زمین ہندو جیل تھی جہنم کی تعلیم سچ معنی پر حیرت و آزادی کی روح گوشہ گوشہ میں بھونک رہی تھی۔ لیکن اب وہی سرزمین مشرق جو ہمیشہ سے طلوع حق و صداقت اور ظہور تہذیب و مدنیت کے لئے مشہور تھی، سو گوار ہے، کیونکہ اُس کا جمال محو ہو گیا ہے، اس کی عظمت مٹ چکی ہے۔ اور غالباً اس سے زیادہ دردناک داستان اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یہ تمام سو گوار یاں خود فرزندان ملک کے ہاتھوں اس کو حاصل ہوئی ہیں۔ کیا ہندوستان کی تاریخ غلامی سوائے اس بد بختی کے کسی اور چیز کی تاریخ ہے، کیا فرزندان آریہ ورت کہہ سکتے ہیں کہ اُن میں وہی غیرت و حمیت، وہی بلند خیالی و عالی نظری پائی جاتی ہے، جوان کے اکابر و اعظم میں پائی جاتی تھی۔ آج ہندوستان کی آبادی کا عنصر غالب غیر کی حکومت سے آزاد ہونے کے لئے بیتاب ہے، لیکن کبھی اسے اس پر بھی غور کیا ہے کہ وہ خود اپنے برادران وطن کے ساتھ کس سلوک و رواداری کو جائز رکھتا ہے۔ ہندوستان کے لئے آزادی اور سورج کے طلوع کا حکومت موجودہ سے اپنے فطری و ملکی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں، لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے ملک کی اُس آبادی کے جذبات کا خیال نہیں کرتے جس کے ضعیف شانوں کی مدد حاصل کئے بغیر یہ بار آسانی سے نہیں اٹھ سکتا

آج ہندو جماعت مسلمانوں کی عصیت و تنگ نظری کی شاکی نظر آتی ہے، لیکن کیا واقعات اور عملی زندگی

تجربات جن کا مشاہدہ روز بروز ہوتا رہتا ہے، اس حقیقت کو ملحوظ رکھیں کہ جو جماعت ہم سے فراخ دلی اور رواداری چاہتی ہے وہ خود ہمارے لئے کس درجہ تکلف، تنگ نظر اور متعصب ثابت ہو رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس جماعت کے قاید و رہنما بھی اس مرض میں مبتلا ہیں، لیکن یہ الزام ان سے کبھی رفع نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس علم کے انھوں نے کبھی اپنے ملک کو صحیح معنی میں اس نقص کے رفع کرنے پر آمادہ نہیں کیا

ملک کی آزادی نہ گول میز کانفرنس سے مل سکتی ہے، نہ سول نافرمانی سے، بلکہ وہ میرا سکتی ہے صرف اتحاد و اتفاق سے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب چھوٹی جماعتوں کے دلوں سے تمام اندیشے نکال دیئے جائیں۔ نہرو رپورٹ خواہ کتنی ہی مناسب کیوں نہ رہی ہو اور اب آزادی کا اعلان خواہ کتنا ہی دلچسپ کن کیوں نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے دل خطرات سے لبریز ہیں اور عملی زندگی کے تجربات نے ان کو ہندوؤں کی طرف سے سخت بدظن و بددل کر رکھا ہے اگر آج گاندھی اور نہرو نہایت فراخ دلی سے اس امر کا اعلان کر دیں کہ وہ مسلمانوں کی تمام شکایات سننے اور ان کے مداوا کے لئے طیارہ ہیں تو ابھی یہ دور تند بدمذہب دور ہوا جاتا ہے اور منزل مقصود قریب۔ لیکن ہر کوئی معلوم ہے کہ یہ نہیں ہو گا اور حصول آزادی کے بعد ایک نہایت ہی المناک قسم کی اندرونی جنگ شروع ہوگی اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ اس انحلال کا نتیجہ کیا ہو یقیناً ہندوؤں کی جماعت کثیر ہے، صاحب دولت ہے۔ صاحب علم ہے، اور ان کے مقابلہ میں مسلمان کم ہمت، کم طاقت و غریب ہیں، جاہل و بد نصیب ہیں، لیکن یہ حقیقت بھی غالباً ہندوؤں سے مخفی نہ ہوگی کہ ہر چیز کی ایک حد ہو کر تھی ہے اور مجبوری کے عالم میں انسان بھی کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے

گاندھی نے حکومت کو اعلان جنگ دیدیا ہے اور ملک کو آمادہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے سینوں کو حکومت کی تیغ و تھنگ سے زخمی ہونے کے لئے کھول دے اور اس میں شک نہیں کہ یہ وہ طریق کار ہے کہ اگر سارا ملک اس پر آمادہ ہو جائے تو دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ مسلمان بہت کم اس میں حصہ لیں گے اور ہندو بھی کوئی ایسا محاذ قائم نہ کر سکیں گے جس کی کمزوری سے مخالف فائدہ نہ اٹھاسکے

ماہ گزشتہ کے نگار میں اپنے سفر حیدرآباد کا اعلان کرنے کے بعد حضرت ہوش بگرامی کا تادڑھول ہوا کہ رمضان کے بعد آنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ زمانہ وہاں عام تعطیل کا ہوتا ہے۔ اس لئے میرے سفر کی خبر تو مشترکہ ہو گئی اور میں یہیں رہ گیا۔ مجھے اپنے ان احباب سے سخت ندامت ہے جنھوں نے مجھے ناگپور، پلہار شاہ اور دوسرے مقامات پر ریل میں ڈھونڈنے کی جہت کو افرامائی۔ یقیناً یہ میری غلطی تھی، لیکن شاید ایسی ہولناک قسم کی نہیں کہ اس کو نظر انداز نہ کیا جاسکے۔ بہر حال اب مارچ کے دوسرے ہفتہ میں روانہ ہونے کا قصد ہے، لیکن تعین تارخ نہ کر دیتا، کیونکہ بالکل ممکن ہے اب ہوش صاحب مجھے ”قلعہ جٹا“ کھڑک روک دیں، فردوس میں جگہ پانے کے لئے رضوان کے ناز اٹھانا ہی پڑتے ہیں اور اٹھاؤنگا جب تک ”ہوس نشاط“ کا

سودا سر میں موجود ہے۔

اس ماہ کے مضامین میں پہلا مضمون مولوی عبد المالك آروى كا حزين پر ہے جو ختم ہو گیا۔ اس مضمون کے دو حصے تھے ایک تاريخى دوسرا تنقيدى۔ تاريخى حصہ کے متعلق فاضل مقالہ نگار نے جو كاش کی ہے وہ كسى طرح نظر انداز نہیں ہو سکتى تنقيدى حصہ البتہ تشنه رہا اور اس سے كہیں زيادہ استقصاء، كاستحقى تھا۔ حقيقت یہ ہے كہ جناب عبد المالك صاحب وجود اپنے مشاغل معاش كى كثرت كے جتنا وقت مطالعہ و تحرير پر صرف كر ديتے ہيں وہ كسى دوسرے كے بس كى بات نہیں۔ كاش زمانہ انھيں فرصت ديتا اور وہ اپنے ذوق و ولولہ كے لحاظ سے زبان كى خدمت انجام دي سكتے۔

ظفر قریشی كے فسانہ ميں كوئى خاص بات سوائے اس كے نہیں كہ ”تعبير نقش“ كو اچھے پيرايہ ميں ظاہر كيا ہے۔ جناب رفيعى كا افسانہ جو مرقا كے عنوان سے لكھا گيا ہے، يہ عجيب خصوصيت ركھتا ہے كہ اس كے لكھنے والے برواقى مرقا كا دھوكا ہوتا ہے اور بڑھنے والا بھى اپنى جگہ سوچنے لكھتا ہے كہ كہيں وہ تو اس مرض ميں مبتلا نہیں ہو گيا فسانہ نگارى كا ايكا خاص اسكول ہے جو فسانہ كى تمام كيفيات كو اپنے اور بطارى كركے ناظرين كو بھى اس سے متاثر كرنا چاہتا ہے اور جناب رفيعى نے اسى اسكول كے متبع ميں يہ فسانہ لكھا ہے۔ ليكن اگر اس كے علاوہ فسانہ نگار كا مقصود اس سے محبت كے فلسفہ پر بحث كرنا ہے تو مجھے اس كى صداقت سے انكار ہے۔ اور اس باب ميں مجھے اُن كے اس دوست سے اتفاق ہے جو محبت كے مفہوم كو اسى عالم گوشت و پوست سے متعلق كرتا ہے۔ يہ عشق اور وحدت الوجود كا اجتماع كبھى ميرى سمجھ ميں نہیں آيا۔ اجمير كى فضائين پرورش پانے والے دماغ لكن ہے اس ملاحظہ سے اپنے آپ كو آزاد نہ كر سكيں

مومن و كلام مومن كا سلسلہ پھر شروع كيا گيا ہے جس كے دلچسپى سے كسى كو انكار نہیں ہو سكتا۔ جناب محشر عابدى كا فسانہ ”آفتار“ خوب ہے۔ ميں بارڈى كى تعريف كيون كرون، اسى كو كيون نہ دادو جئے اس خوبى سے اُسے اُردو ميں منتقل كيا اور نگار كو بغرض اشاعت روانہ كيا۔ اور اگر اس نوع كے المناك فسانہ لكھنا كوئى عيب ہے تو اس كے ذمہ دار محنون گور كھپورى ہيں جنھون نے سب سے پہلے اپنے افسانوں كے لئے بارڈى كا انتخاب كركے اس بدعت كو عام كيا۔

سلطنت برطانيہ كے متعلق جو مضمون درج ہے وہ بالكل وقت و موسم كى چيز ہے اور موجودہ حالات كے ماتحت اُسے حد درجہ دلچسپى كے ساتھ پڑھا جانا چاہئے

ہمارے دوست سيد مقبول احمد صاحب بى اے كا مضمون مسلمانوں كے عقايد كے متعلق حقيقاً تہيد ہے ايكا اور مضمون كى جو اس كے بعد شائع ہونے والا ہے۔ نظميون ميں حافظ غايز پورى كى نظر اچھى تحصيل كا نمونہ ہے۔ اور آخر شيرازى نے جو كچھ لكھا ہے وہ حد درجہ بھجان انگيز محاكات پر مبنى ہے سچ كہا ہے كسى نے كہ خدا جو ان كے ليكن جوانى كا احساس نہ بيد ہونے دے۔

نيز

شیخ محمد بن ابوطالب علی حزمین لاہجی

(یہ سلسلہ سابق)

حزمین کی شاعری پر متقدمین کا اثر | شیخ کے محاسن کلام، اور ندرت فکر کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان عناصر کی تحقیق کر لی جائے، جو شیخ کی ارتقاء فی تخیل میں موید ہوئے، طریق جستجو کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، تاریخی روایات یا خود شیخ کے کلام کا گہرا مطالعہ، پہلی صورت آسان ہے لیکن اس میں شدید تحقیق کی ضرورت خود اعتمادی میسر نہیں آتی اور دوسری صورت مشکل ہے، لیکن کسی مسئلہ پر اجتہاد ہی اور تحقیقی نظر ڈالنے والے افراد کے لئے نشاط باطن کا سبب ضرور ہے اور ارباب نظر کے نزدیک بھی یہ آخری طریقہ استنباط یقیناً قابل ستائش ہوتا ہے، گو جو بایں حق سے اجتہاد اور قیاس میں لغزشیں ہوں کیونکہ نہ ہوئی ہوں، لہذا میں بجائے تاریخ کی ودق گردانی کرنے کے خود شیخ کے کلام پر ایک گہری نظر ڈال کر یہ جستجو کرنا چاہتا ہوں کہ شیخ نے فارسی شاعری کے کن مبادی سے استفادہ کیا، ہر مسلک کے رہرو کے لئے یہ تاثر یہ ہے کہ وہ بدرقہ راہ یا نقش قدم کا جو یان ہوا، رینا لڈائے نکلس نے مقدمہ دیوان شمس تبریز میں مولانا روم جیسے باکمال اور بلند پایہ شاعر کے محاسن افکار کی تفصیل کرتے ہوئے ان مبادی کا تذکرہ کیا ہے، جن سے مولانا مستفید ہوئے، اسی طرح عرفی جسکی آتش بیانی، سحر طرازی، اور زور بیان کے متعلق تفصیل سے لکھ چکا ہوں، تعلی اور اظہار کمال میں غلو کرنے کے باوجود متقدمین کے فیضان سے بہرہ اندوز ہوئے، لہذا شیخ حزمین بھی اس فطری تقلید سے اعراض نہیں کر سکتے تھے،

شیخ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ رومی، حافظ، سعدی، فغانی، نظیری اور سنائی سے بہت عقیدت رکھتے تھے، چنانچہ بعض غزلین ایسی ہیں جنکے مقطع میں آپ نے اپنی عقیدت مندی کا اظہار بھی کر دیا ہے، جس غزل میں جس قدیم شاعر سے اپنے اظہار عقیدت کیا ہے، وہ ادا کے بیان، لطافت فکر، اور مانت ذوق کے اعتبار سے اس شاعر کے کلام سے لمجائی ہے۔

مولانا رومی و حزمین | شیخ ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں۔

حزمین از عارف رومی صلائی عشرتہ وہ کہ سانی ہر چہ در یاد تمام آورد دستا نرا
اس غزل میں تمام و کمال رومی کا طرز بیان ہے، وہی جلوہ آئی ہے، وہی بے خودی اور ولولہ صوفیانہ فرماتے ہیں۔
درید نہائے جیب غنچہ از باد سحر کا ہے برون از خرقة ناموس و تام آورد دستا نرا

لے نگار بابت الکوبر ۲۸۰ غالب بے نقاب کجایات "لے نگار بابت و مبر ۲۸۰ خواجه سید محمد شیرازی

اسی طرح فروغ خلوت، عالم شہود اور رموز وصل کی یوں پردہ درمی کوہتے ہیں
دو عالم خلوت یا راست مطرب پردہ سر کن سروش خاص اور بزم عام آوردستانرا
ایک دوسری غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:-

(۲) برگش از دل نفس مولوی روم حسنین تاز گلزار و سمن ربیع خزان بر خیزند
یہاں بھی مولانا رومی ہی کی طرح علم حقیقت، اور تصوف کے مباحث پیش کئے ہیں فرماتے ہیں
یا تو در خلوت دل وصل مدامی خواہم کز میان کلفت روزان و شبان بر خیزند
اسی خیال اور اسی رنگ میں مولانا رومی کی غزل کا ایک شعر یہ ہے
عمر ابد پیش من ہست زمان وصال زانکہ ننگبد در واپسج زمانی مرا
شیخ اپنی ایک اور غزل میں مولانا رومی کے متعلق فرماتے ہیں

(۳) این جواب غزل مرشد روم است کہ گفت من ہوئے تو خوشم نافذ تاتار گیر
اس غزل کے تمام اشعار کو رومی کے خیالات سے چندان نسبت نہیں البتہ طعن زندانہ، لہجہ تنگدہ، بے باکی ادا اور راز و نیاز میں
حافظ کے کلام سے مماثلت ہے، ملاحظہ ہو۔

من خرابایم اے شوق مرا یا رگیر نیکنامی تو رہ خاندن خسار گیر
غبن برین طرہ چہ انداختہ بر سر دوش کافر عشق تو مائیم تو زنا رگیر
گر بہ گستاخیم از سینہ صغیرے زوہ سر رحم فرما دبا بن مسرغ گرفتار گیر
ایک مقام پر اور لکھتے ہیں

(۴) اشعار عشق وستی ست اشعار عارت روم گفتار نیست لیکن گفتار می نماید
خواجہ حافظ شیرازی اور حزمین کے افکار نے وہ اثر آفرینی نہیں کی، چنانچہ آپ کے بعد جتنے اکابر شعر اچامی، عرفی، صاحب
حزمین وغیرہ گورے سبحون کے کلام میں حافظ کی رنگینی ادا، اور میتابی خیال پائی جاتی ہے، مرزا غالب نے تو شاعری کے وہ تمام
نقوش و رموز پیش کر دیے جو خواجہ حافظ کا طعرائے امتیاز ہیں، اور جس سے غالب کے قبل اردو کا دامن معر تھا، شیخ حزمین
کو خواجہ موصوف سے بھی ایک خاص عقیدت تھی، فرماتے ہیں
دل از نغمہ حافظ بہ سماع است حزمین در ہنایہ عشرت صنتے خوش دارم

یہ نغمہ حافظ دلم از ہوش حزمین این نشادہ بخشد می شیراز مرا

دم حافظ برد از دل غم دیرینہ حسرتیں اے صبا نکھتے از خاک رہ یا بسیار

می برد مصرعہ حافظ دلم از دست حنین تکیہ بر عہد گل و باد صبا نتوان کرد

تازہ کردی روش حافظ شیراز حنین کہ ز انفاس خوشش بوئے کسے می آید
حافظ اپنے ادائے بیان میں آپ ہی اپنی نظیر ہیں لیکن حنین نے جو ہم آہنگی اور تمثیل کی کوشش کی ہے، وہ بھی ناکام حنین
رہی بلکہ مختلف اثرات کے اختلاط، اور افکار کی آمیزش نے حنین کو لطافت خیال اور غرابت ادا کا ایک ایسا دلکش مجموعہ
بنادیا جسکی پذیرائی سے کوئی صاحب نظر اعراض نہیں کر سکتا، موازنہ سے یہ نظریہ ایک حد تک واضح ہو گا۔

حافظ

حنین

نکتہ روح فزا از دہن یار بگو
نامہ خوشنجر از عالم اسرار بیار

اے صبا نکھتے از لعل لب یار بسیار
گہرے تحفہ ز گنجینہ اسرار بسیار

حافظ اور حنین دونوں کے یہاں صبا سے خطاب ہے، الفاظ ملتے جلتے ہیں معنی بالکل ایک ہیں، حنین کے یہاں ”لعل لب یار“ اور گنجینہ
اسرار“ ہے، جسے حافظ نے ”دہن یار“ اور ”عالم اسرار“ کے الفاظ میں پیش کیا ہے، اگر حنین کے تجربہ علمیہ کے تاریخی واقعات ہمارے
پاس موجود نہ ہوتے، تو ہم اسے یقیناً سرقہ کہتے، لیکن اتنا تو مزور ہے کہ حافظ کی اس غزل کا مطالعہ کر کے بعد شیخ صاحب کو اس رنگ
اور معنی میں کچھ کہنے کا خیال ہوا، لہذا حنین کی پوری غزل حافظ کی غزل سے غیر شعوری طور پر مستفاد ہو گئی

تا مسطر کنم از لطف نسیم تو مشام حافظ
شمتہ از نفحات نفس یار بسیار

حسنین
داسن آلودہ بہ بوئے گل فردوس مکن
ہر چہ می آردی از خاک رہ یار بسیار

الفاظ متغایر ہیں لیکن معنی کے لحاظ سے دونوں ایک نتیجہ پر پہنچے ہیں یعنی ”بوئے دوست“ کی طلب، حصول مراد کے لئے
دونوں کے یہاں وساطت پائی جاتی ہے، حنین خاک رہ یار ہی سے اپنے بڑے جذبہ کا سامان سکون پیدا کرنا چاہتے ہیں خواجہ صاحب
کو نفس یار سے آسودگی ہوتی ہے، بیتابی دل کے اعتبار سے حنین کا شعر بڑھا ہوا ہے،

شکر آنرا کہ تو در عشرتی اے مرغ چین حافظ
با سیران قفس خردہ گلزار بسیار

حسنین
اے کہ از سیر چین بال فشان می گزری
برگ سبزے سونے مرغان گرفتار بسیار

دونوں کے یہاں ایک خیال ہے، دونوں گرفتار قفس ہیں، دونوں قیوب کی نظر محنت کے طالب ہیں اور چین میں لوٹ کر جانے کے متمنی ہیں۔

دل دیوانہ ز زنجیر نی آید باز حافظ
قلعہ از خم آن طسرة طرا بسیار

حسنین
لب مخور مرا جرعه نہ بند دساقی
چون رسد دور بہن میکدہ بردار بسیار

الفاظ متضار ہیں نظائر و خیالات معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل دونوں کے میان ایک ہی خیال ہے، ایک ہی جذبہ ”قلزم آشامی“ ہے، اور ایک ہی وسعت شوق ہے، حنین کہتے ہیں ایک گھونٹ سے کہیں لب غمور کی تسکین ہوتی ہے۔ پورا میکہ اودھا لاؤں گے گئی ساقی کی نخت قلزم آشامی میری (غالب) خواجہ حافظ کے بیان بھی شوق کا وہی دنور ہے، اور جاس کی وہی ناپید کناری بچھڑاتے ہیں کہیں دیوانہ کا دل زنجیر سے رکتا ہے، جسا و محبوب کے کامل پہچان سے ایک تارے آؤ، عرفی نے کیا خوب کہا ہے،

ہمہ جا وحشی از انست کہ رام است اینجا

بہو اداری از ان سیب ز نخدان بوئے
کام جان تلخ شد از صبر کہ دم بے دوست حافظ
حزین
گر تو انی بہ مشام من میا ربار
عشوہ زان لب شیرین شکر باربار
تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دونوں کے بیان ایک خیال ہے، حنین کا مقصدا ”سیب ز نخدان“ کی بو ہے، حافظ کی طلب ”لب شیرین“ کا عشوہ، البتہ دونوں کی صورت تحلیل میں اختلاف ہے، لیکن غور کرنے سے دونوں کے بیان طلب کی علت غائی بھی ایک ہی معلوم ہوتی ہے، حنین نے ”بیار“ ظاہر کر دی ہے، حافظ نے اسی کو ”کام جان تلخ شد“ میں پیش کیا ہے

چند پردوش توان خرقہ ناموس کشید
دقی حافظ بچہ از دہر میش رنگین کن حافظ
حزین
مست از صومعہ ام تا سر باز از ربار
دائلمش مست و خراب از سر باز از ربار
ایک ہی ”جذبہ بے اختیار شوق“ ہے، اور ایک ہی متانہ انداز ذوق، حافظ صاحب اپنی عادت قدیم کے مطابق دقیق درویشی کو شراب سے مٹوٹ کرنا چاہتے ہیں، حنین اپنے خرقہ (تصوف) کو شراب میں ڈبو تا تو نہیں چاہتے لیکن نام رنگ سے سبکدوش ہو کر حافظ کی طرح مست و خراب، بر سر باز از گورنا چاہتے ہیں

گرچہ در سینہ صد آتش دارم
حافظ چون غم و شادی جہان در گزراست حافظ
حزین
للمداحد کہ با سوزش دل خوش دارم
بہتر آنست کہ من خاطر خود خوش دارم
تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دونوں شعراء میں ایک ہی خیال پایا جاتا ہے، حنین نے اپنے آتشکدہ دل کے سوز و پیش کو ظاہر کر دیا ہے، حافظ صاحب نے ”سوزش دل“ کی تصریح کر دی ہے، اور غم و شادی کی لذت و الم سے جدا ہو کر وجود کی سبقتی سے متاثر ہیں، اور حنین کی طرح با وجود محرکات احساس، ایک نشاط باطن اور کیف نفس محسوس کر رہے ہیں،

بار عشقے کہ از ان چرخ بہ زہا رآمد
نادک غمزہ میا وزرہ زلف کہ من
حزین
گوہ دیدیست کہ بر جان بلاکش دارم
جنگھا با دل مجروح بلاکش دارم

دونوں مختلف خیالات ہیں، حنین کہتے ہیں ”جان بلاکش“ پر ایک ایسا بار عشق ہے جس سے آسمان بھی پناہ مانگتا ہے، اور دل میں بہاؤ کی طرح ایک درد گراں محسوس کرتا ہوں، حافظ صاحب کے بیان ایک میدان مقاتلہ ہے، ایک طرف ”دل مجروح بلاکش“ ہے اور دوسری طرف خود، لہذا محبوب سے سامان حرب طلب کر رہے ہیں اور وہ ”ناوک غمزہ“ اور ”زرہ زلف“ ہے

حنین نکند تیرہ غبار غم ایام مرا
مشریہ صاف ترا ز بادہ بغیش دارم
گر یہ کاشاؤ زندان قدسے خواہی زد حافظ
نقل شیر و شکرین و می بغیش دارم

کسی قدر اختلاف ہے، لیکن اصولی حیثیت سے دونوں کے بیان ایک ہی خیال ہے، اور ایک ہی پراسن زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، حنین ”غم ایام“ کی تیرگی سے آزاد ہیں حافظ صاحب کے ”کاشاؤ زندان“ کی کیا بات ہے وہاں شیر و شکر کا چرچہ ہے، اور شراب و کباب کا سامان، اسلئے دونوں کی زندگی نتیجہ کے اعتبار سے ملتی ہوئی ہے۔

حنین با سر زلف تو گویا شدہ گشاخ صبا
بے سبب خاطر مجموع مشوش دارم
ور تو زین دست مرا بے سرو سامان داری حافظ
من بہ آہ سحر زلف مشوش دارم
تذکرہ زلف دونوں میں مشترک ہے البتہ دونوں نے اظہار خیال کے دو طریقے اختیار کئے ہیں

حنین نرد و از سر سودازدہ تاحشر بردن
پیچ و تاب نہ کہ ازان طرہ دلکش دارم
یک سرموئے بدست من و یکسر بادوست حافظ
ساہا بر سر این موئے کشاکش دارم
حنین اور حافظ دونوں کے بیان معشوق کے کامل بیچان کا تذکرہ ہے، حنین کے بیان پیچ و تاب ہے، حافظ نے اسے ”کشاکش“ میں ظاہر کیا ہے، زلف کی اثر آفرینی دونوں پر یکساں ہے

سنائی و حنین حکیم سنائی عہد غزنویہ کے ”رومی“ تھے، آپ مولانا سے پہلے گزرے ہیں آپ کی کتاب حدیقہ کا ایک انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا ہے، حنین نے آپ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں

از یاد ہرزخے افکار نباید شد
از یاد حنین نہ ہی مصرع سنائی را

حنین نے اپنی بعض غزلیات کے مقطع میں فغانی کے ساتھ بھی ارادت و عقیدت کا اظہار کیا ہے فغانی اپنے عہد کے بڑے استاد سخن گزرے ہیں اور متاخرین کی آتش بیانی اور جوش خیال بڑی حد تک فغانی ہی کے نالہ و فغان سے مستفاد ہے، چنانچہ مجمع النفائس میں تقی اودھدی کا یہ قول مسطور ہے، کہ جب وہ عربی شیرازی کے رفیق و جلسی تھے، اس وقت مشاعرہ میں فغانی ہی کا کلام مصرعہ طرح مقرر ہوتا تھا، (نگار ماہیت و سیر مشاعرہ فی شیرازی) شیخ فرماتے ہیں

دایم حنین ابن غزل از فیض فغانی
ہر جا کہ رود ہجرہ یار است دل ما

ایک دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ہیں

حزمین ازین غزلت تازہ گشت طرغونی سوز سدرہ فرد آید وزمین تو بوسد
رینا نڈاے مجلس نے مقدمہ دیوان شمس تبریز (مطبوعہ کیمبرج) میں سعدی کو ”نیم دل صوفی“
لکھا ہے سعدی کو تصوف کا مذاق تھا تو ضرور، لیکن آپ کے کلام میں اخلاق و موعظت کا گہرا اثر
پایا جاتا ہے، مقدمہ دیوان شمس تبریز مطبوعہ طہران میں فاضل مقالہ نگار نے مجازیات و عشقیات سے تعبیر کیا ہے، اور
حق یہ ہے کہ شیخ سعدی ایک ہمہ دان استاد گزرے ہیں اور آپ فارس کی شقیہ شاعری کے سلسلہ ارتقا کی ایک زیربوت
کڑی ہیں، حزمین نے سعدی کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے، فرماتے ہیں۔

این جواب غزل دلکش سعدی است گفت کہ فی خامہ آتش نفسم رادم از دوست
نظیرن و حزمین - حزمین کے مندرجہ ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے، کہ نظیری کا کلام بھی آپ کے زیر مطالعہ رہا ہے، فرماتے ہیں۔
خونائے حزمین است ز فریاد نظیری بانگے کہ بناشد کند کوہ صدایچ

آخری مصرعہ پر غور کیا جائے، تو پتہ چلتا ہے، کہ نظیری کو حزمین نے اپنا استاد اور رہنما تسلیم کیا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر
جب شیخ کے نظریہ استدلال پر غور کیا جاتا ہے، تو پتہ چلتا ہے، کہ اگر نظیری کا کلام ان کے زیر مطالعہ ہوتا تو وہ شاعری کی لذت سے بھی
نا آشنا نہ ہوتے، ”بانگے کہ بناشد کند کوہ صدایچ“ کا یہی مطلب ہے،

عرفی و حزمین شیخ نے اپنے کلام میں کہیں عرفی شیرازی سے ارادت کا اظہار نہیں کیا ہے، لیکن گزشتہ اوراق میں لکھا جا چکا
ہے کہ شیخ نے عرفی کی ایک رباعی نقل کی ہے، مگر حوالہ نہیں دیا، اس سے میں یہ نتیجہ نکالنا نہیں چاہتا، کہ
شیخ نے عمداً عرفی کا حوالہ نہیں دیا تاکہ ناواقف حضرات اسے آپ ہی کی طرف منسوب کر دیں، بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ
عرفی کا کلام بھی آپ کے زیر مطالعہ رہا ہے، اور اس کا طرز بیان اور اشعار آپ کے دماغ میں محفوظ بھی رہے ہیں، چنانچہ مفصلہ ذیل
موذعہ سے ایک حد تک یہ نظریہ واضح ہوتا ہے۔

حزمین سبند آسا در آتشانیہ میرقص
چو خون در زخم صیدے گشتہ می جوش عرفی
بمال شعلہ چون پروانہ میرقص
جو دل در سینہ پروانہ میرقص ...
مضمون میں کسی قدر اختلاف ہے، لیکن خیال ایک ہے، ”جذبہ پروانہ“ اور ”رقص پروانہ“ دو نو میں مشترک ہے
حزمین برا فلک خرقہ ہنگام سماعست
برافشان دست بر ناموس دانگہ عرفی
حزمین زمستوری براستانہ میرقص
سیان محرم و بیگانہ می رقص

حزمین کا ”برا فلک خرقہ“ اور عرفی کا ”برافشان دست بر ناموس“ معنی کے لحاظ سے ایک ہی خیال پر
مبنی ہے، دوسرا شعر بھی ملتا ہوا ہے، یعنی رقص مستانہ کیلئے دو نو کے یہاں خلوت و جلوت، یا مجلس خاص عام کی قید نہیں،

حزین سرودے نیست بہ از غفل ہے
عجب ذوقے بود در رقص و مستی عرفی
ہپائے شیشہ چون پیمانہ میرقص
تو نیز اے بادہ در پیمانہ میرقص
حزین کے مجازی رنگ نے زیادہ لطف پیدا کر دیا ہے، عرفی نے پیمانہ میں شراب کی جھلک دیکھ کر ”رقص مستانہ“ کا حکم لگایا ہے، حزین نے غفل نے کو وہ صوفیانہ سماع اور ذوقیہ لہجہ ترنم سمجھا، جسکے لئے نہ وضعی پردہ سرود اور قانون سخن کی ضرورت ہے، نہ اسرار و مہیق کے درک کی بلکہ ریٹا لٹاے مجلس کے الفاظ میں سقہ کی آواز، موزن کی پکار ہوا کی سائین سائین، بھیڑ کی صدا، انہیں ایک صوفی کے قلب کو متاثر کر دیتی ہے، یہاں حزین بھی قصوف کے اسی خاص رنگ میں غفل نے کو تحریک سماع کا ایک کامیاب ذریعہ بتاتے ہیں ✓

حزین نہ کہتہ حزین از ذرۂ عشق
مشوعرفی رہین باغ و بلبل عرفی
مدام از جلوہ جانانہ میرقص
بہانگ چغد در پروانہ میرقص
دونو کے یہاں ایک ہی ذوق سماع ہے، اور ایک ہی لہجہ ادا، البتہ صورت استدلال میں فرق ہے، حزین کہتے ہیں سرگردان عشق ”ذرہ“ سے تو کمتر درجہ نہیں ہونا چاہئے، جو جلوہ یار (آفتاب) سے ہمیشہ مصروف رقص ہے، عرفی کہتے ہیں بلغ و بلبل کی قید کیا، دلکو تو ایک دیران کن اور وحشت انگیز الو کی آواز پر بھی محور رقص ہو جانا چاہتے، عرفی کا شعر حزین کے شعر ”سرودے نیست بہ از غفل ہے“ سے ملتا ہے
سطور بالا سے یہ نظریہ واضح ہو گیا ہے کہ حزین کے ذوق شاعری پر رومی، سنائی، حافظ، سعدی، فغانی، نظیری اور ایک حد تک عرفی کے تخیلات کا اثر پڑا ہے، جسکا شیخ نے (بہ استثناء عرفی) اعتراف بھی کیا ہے،

شیخ کی غزلیات پر جب ایک مبصر کی نگاہ پڑتی ہے، تو وہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، ایک عشقیہ و مہاجریانہ حزین نے رموز عشق اور ذوق صوفیانہ کی ایسی تصریح کی ہے، کہ زبان سے بے اختیار ان کلمات حسین نکلتی ہے، مضمون آفرینی، غنویت بیان، سلاست اور نفاست ادا، میں حزین اپنے دور میں فارسی زبان کے سب سے بڑے شاعر گزرتے ہیں، عشق کی لذت آگینیاں کوئی اس دل سے پوچھے، جو کسی نگاہ ناز اور عشوہ لب لعل سے زندگی میں آشنا ہوا ہو، زندگی بھی نشہ شباب کی فریب خوردہ نہیں، بلکہ ایک پاک اور محتاط زندگی، جسے ہجر میں برویلیائی نے ”گرم قریاد“ اور دیدہ پر تمنا کو مصروف اشک ریزی رکھ کر محبت کے سخت اور خطرناک منزلوں سے اس سطح پر پہنچا دیا ہو جہاں مجاز حقیقت میں ملکر ایک ایسا ارفع احساس پیدا کر دیتا ہے، جسے کچھ وہ انسان سمجھ سکتا ہے، جسکے سامنے ”بند نقاب حسن“ برطوت ہو کر ”غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا“ کا منظر موجود ہو، فارس کی عشقیہ شاعری سے کامل طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے ضرور ہے، کہ انسان اپنی زندگی کے اس دور کی یاد

تازہ کرے، جسے شکسیر کے الفاظ میں ”حیات کے سات مراحل“ میں سے ”مرحلہ عشق“ کہتے ہیں، وہ عشق نہیں جس کے باطنی فیوض و برکات کو طوفان شباب بہلے گیا ہو، بلکہ وہ پرکیت محبت اور نشاط انگیز لذت درجسکے امیال و عواطف نے انسانی زندگی کو ”ریخ نو میدی جاوید“ کے باوجود کسی عذرہ یا سلسلی سے وابستہ رکھا ہو، سامان وصل مفقود ہو، تکلم و ترسل استحالہ کی حد تک پہنچ گیا ہو، اگر انفرادی زندگی کا وہی دور ہو یا کم از کم اس دور کا نقشہ پیش نظر ہو، تو حزمین کی عشقیہ شاعری البتہ ایک سمند ناز کو نطف تازیانہ سے آشنا کر سکتی ہے، ملاحظہ ہو۔

دل در شکن زلفت صبح طربے دارد	مہتاب بنا گوشت فرخندہ شبے دارد
در میکدہ خاکم را پیسا نہ کنی یارب	شاید دل حسرت کش لب را پیسے دارد
افسانہ کند خواہش آشوب قیامت را	دل بیدہ در کوشش شور و شبے دارد
بے ریخ نہ شد حاصل نہ کفر نہ ایما تم	از بتکدہ تا کعبہ ریخ و تعبے دارد
بکشائے حزمین چشے کان مہرجان آرا	در محل ہر ذرہ یسلی سنبے دارد

”شکن زلف“ کے ساتھ ”صبح طرب“ اور ”مہتاب بنا گوشت“ کے ساتھ فرخندہ شب کا تلازم ایک نہایت دلکش طرز بیان ہے، استعارہ جمیل قابل داد ہے، دوسرے شعر کے متعلق مقدمہ میں لکھا جا چکا ہے، ”آشوب قیامت“ کا ایک فسانہ ہو جانا، کچھ وہی سمجھ سکتا ہے، جسے قیامت کے ہولناک واقعات کا احساس ہو، اور پھر خواب ناز میں محو ہو جانے والے کو بھی دیکھا ہو جسکی اداۓ بیدار اور رعنائی نے قیامت کو محض ایک افسانہ بنا دیا ہے، غالب کہتے ہیں ”کیا خوب قیامت کہے گویا کوئی دن اور“ کفر و ایمان کا ایک سطح پر آجانا بہت پر لطف ہے، اس طرز میں عرفی کے بہترے اشعار پائے جاتے ہیں آخری شعر وحدت فی الکثر کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ (مذمتہ ص ۷۷) فارسی شاعری کا ایک نہایت اہم موضوع تخیل ہے مولانا روم کے اکثر اشعار اسی خیال سے متعلق ہیں،

✓ ازین دہشت کہ چہ را نہ مہا در کمین باشد ز حسرت ہر نگاہ من نگاہ واپسین باشد
شیخ نے جس سرشارانہ طریقہ سے ”حسرت نگاہ“ اور ”نگاہ واپسین“ کا نقشہ کھینچا ہے، اسے وہ ناکام محبت سمجھ سکتا ہے جسے شوق و انتظار کے بے شمار مراحل طے کر لینے کے بعد محبوب کی اتفاقی ملاقات نصیب ہو جائے، اور یہ صلت اندیشہ ناک سے خالی بھی ہو، اسوقت نگاہ پر حسرت کی یاس افزا تلنگی وہی منظر پیش کرتی ہوگی، جو ایک دردمند محبت محبوب سے جدا ہوتے وقت ”نگاہ واپسین“ (آخری نظر) کی صورت میں پیش کرتا ہے، الفاظ تشریح کے لئے ناکافی ہیں ہاں تصور کے بعد ہر شخص لذت احساس سے منکیف ہو سکتا ہے۔

گرہ ساز در بان شعلہ شمع انجمن پیرا
بر محفل کہ حرفے زان عذار آتشین باشد

اس غزل کا ہر شعر حزمین کے وفور تمنا کا منظر ہے، یہاں تشبیہ، تجنیس، مدح، تمام خصوصیات نے ملکر شعر کو نہایت بلند سطح پر پہنچا دیا ہے، جس محفل میں سلی کے عذار آتشین کا تذکرہ آئے وہاں شمع کی ٹوکا نمود اضطراب شاعر کے جذبہ کی ناپید کناری کا ایک اعلیٰ ثبوت ہے، ”زبان شعلہ شمع“ سے محبوب کے رخسار کی تشبیہ، اور پھر مشبہ بہ پرمشہ کا تفوق جداگانہ لذت انگیز ہے، مگر حصول لذت کے لئے تصور شرط ہے

شود در موج آب زندگانی سبزہ اش غلطان دران گلشن کہ ابر دئے ترا از ناز چین باشد
”چین چین“ یا سے گلشن میں نباتات پر تردد تازگی آجا نا دہی سمجھ سکتا ہے، جو عرصہ کی نسر دگی حیات کے بعد محبوب کی غلط انداز نگاہ ناز سے لذت آشنا ہوا، ہو

فریب حرف و صورت خضر از جابری آرد کہ آب زندگانی لعل ترا زیر نگین باشد
اب حیات لانے میں خضر کی ناکامی کا راز یہ ہے کہ اب آب حیات کا مقام ظلمات نہیں رہا بلکہ وہ اب شمع کے محبوب کے لعل کے زیر نگین ہے، کیا لطیف اسلوب بیان ہے، کس خوبی سے ”لب لعل“ تک دسترس ہونے کو آب حیات تک رسائی سے تعبیر کیا ہے، پردہ ظلمات کو طے کر لینے کے لئے جن منازل سے گزرنا ناگزیر ہے، وہ الگ، سکندر کی سرشتگی اور نامرادی کا فسانہ بھی پیش نظر ہے، محبوب کے لب لعل سے سیرابی کی تمنائیں بھی دقتیں ہیں، اور نامرادی و یاس کا منظر،

نگاہ گرم چون رخسار آتشین تو بوسد عرق چون شبنم گستاخ یا سمن تو بوسد
جذبات، تشبیہات اور استعارہ کے مخلوط اثر نے شعر میں بڑی حلاوت پیدا کر دی ہے، - منظر پر خیال کیجئے اور جذبات کی داد دیجئے، ایک عاشق میباک، شاہد ناز کے رخ زیا پر نظر جمار ہا ہے، یہ گو یا رخسار کا بوسہ ہے جو نگاہ لے رہی ہے، یہیں تک بس نہیں آگے دیکھئے اس منظر سے محبوب پر کیا اثر ہوتا ہے، جذبہ حیا میں محبوب کے چہرہ سے پسینہ نکل آیا ہے، محبوب کو بھی بازاری نہیں ہونے دیا، ایک نہایت پاک سیرت اور عصمت دار تصور کیا، یہیں تک ختم نہیں ہے، بلکہ اس منظر کی بھی ایک اور تشبیہ دی ہے، جو اسقدر لطف انگیز ہے کہ دل چھوٹک اٹھتا ہے، اس عاشق میباک کی نظر بازی سے محبوب پر جذبہ حیا طاری ہوا، حیا کا مقتضا تھا کہ پسینہ نکلے، اب پسینہ کو ”شبنم گستاخ“ سے تشبیہ دیتے ہیں جو یا سمن کی پنکھ بوسہ لیا کرتی ہے، گو یا رخسار محبوب یا سمن ہے اور پسینہ ”شبنم گستاخ“

خدا کے راخز امی یہ کشت بارغ مبادا دہان غنچہ کھٹ پائے نازنین تو بوسد
صوفیہ جذبات کی داد دیجئے، محبوب کی سیر بارغ سے غنچہ ”کا کھٹ پائے نازنین“ کو چوم لینا، شاعر کی عجیب وار فکری محبت کو ظاہر کرتا ہے،

بیا بتاب بازوئے حسن دست تجلی کہ معزید میضاسر آستین تو بوسد

حافظ:- زحسرت لب شیریں ہنوز می بینم کہ لالہ می دم از خاک تربت فرہاد
جامی:- بسکہ رفتند شہیدان عمت زیر زمین لالہ ہا غرقہ بہ خون می دم آن صحرارا
صاحب:- یادگار جگر سوختہ مجنون است لالا چند کہ از دامن صحرابہ خواست

رم وحشی بنگاہ او بوشت دادہ آرام دماغم را بشور آورده آہوئے کہ اودارد
جبین کعبہ و دیراست بر خاک نیاز او چہ مہربست یارب طاق ابروئے کہ اودارد
ندارد گر نظر با ماتافل نیست کارافرا نگہ رامی فرسید جہیم جادوئے کہ اودارد
حزین آشفتمہ عالم آہ ازان دامن فشانہا بطونان می دہد خاک مرا کئے کہ اودارد
رم وحشی بنگاہ، محراب طاق ابرو، ”دامن فشانہا“ اور خاک عاشق کا سپرد طونان ہونا، غضب کے فقرے
ہیں، نزاکت، تحنیل اور لطافت احساس قابل داد ہے

دل عاجز حریف ترک چہمت کے تو اندشہ بخون غلطانہ مہر گانت صف خجرو لہارا

حزین کی صوفیانہ شاعری | شعرائے فارس میں مشکل سے کوئی ایسا شاعر ہوگا جسکی غزلیات میں تصوف کی چاشنی
ہو، اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ فارس کے اکابر شعر او اسانہ سخن رہر و طریقت تھے،
دنیا کو نقش قدم کی تلاش رہتی ہے متاخرین میں جو صوفیانہ مذاق نہ بھی رکھتے تھے، انھوں نے بھی صوفیانہ طرز میں کہنا
شروع کیا، تعلیم کے اعتبار سے حزین ایک مشہور صوفی شیخ خلیل اللہ طالقانی کے تربیت یافتہ تھے، دوسری بات یہ ہے کہ اکثر صوفی
ہی شعرا کلام آپ کے زیر مطالعہ رہے، جسکی تفصیل اوپر گزر چکی لہذا آپ کے کلام میں بکثرت صوفیانہ جذبات پائے جاتے ہیں
نہ در کنعان نہ در بازار مصرت می توانی یلن بیاباں گرد حیرت کردہ شوق کار و اہارا

گر بیان چاک باشد دق ماتردانان تاکے بے آلودہ گردان فرقتہ برہیزگار راں راں
سلوک در طریق عشق با یاراں چناں ماند کہ مورنگ ہر اہی کند چابک سواراں را

چولالہ باچمن حسن و عشق خواست مرا مے مجاز و حقیقت بیک مبدوست مرا
بہ گرد بام و درم و دیر و کعبہ می گردو ازان زماں کہ بدرگاہ عشق روست مرا

ز خود دہنی شدہ ام چوں فی وز نالم پر م خروش درد تو بیچیدہ در گلوست مرا

ہیں تنہا نہ من در خاک و غول غلطیدہ ایم نہاد آں زلف مشکیں بر زمیں ناف غزالاں

شایستہ برق است بہ صحرائے ملاست
✓ پیرانہ سرآزادگی از عشق نہ اریم
اے یخچراں پائے طلب رنجہ مصانید
✓ گرموج زندربل ماتلخی عالم
یاراں سبکیر رسیدند منزل
دستاں زن مستیم حزمین تانفسہ هست
خارے کہ بہ خوں تر نہ شد از آبلہ ما
ہنگام شدہ در گردن ماسلسلہ ما
نہ یک تر از ماست بہا مرحلہ ما
ہرگونہ زند چیں بہ جیں حوصلہ ما
چون نقش قدم ماندہ بجاقا فلہ ما
از عشق نکو نام بود سلسلہ ما

تشبیہ جمیل اور استعارہ طبع نے لطافت معانی کو دوبالا کر دیا ہے، آبلہ پا ہو کر حوصلہ ہادیہ پیمائی اور پیرانہ سالی میں بھی وابستگی قابل داد ہے، سلسلہ دوامی میں مقید رہتے رہتے زنجیر کارگ کی شکل میں منتقل ہو جانا، نہایت لطیف انجیالی کی طرف اشارہ کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ ضعیفی میں رنگین ابھرتی ہیں تو گویا رنگائے گردن وہ ”سلسلہ محبت“ ہیں جس میں بدتون گرفتاری رہی، لہذا جب قید و بند کا تعلق فطرت جہانی سے ہو گیا تو گویا اسکے یہ معنی ہیں کہ اس وقت بھی آزار محبت سے آزاد ہونا، ناممکن ہے، پانچواں شعر بہت یاس افزا ہے۔

حزمین نے خود اعتراف کیا ہے کہ انکی شاعری میں صوفیانہ فکر و عقاید کی روح مولانا روم کے فیوض ویرکات کی منت کش ہے، اس سلسلہ میں شیخ اور مولانا کی فصلہ ذیل غزلیات کا موازنہ حقیقت کو اور واضح کر دیتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے مولانا کی غزل پڑھنے کے بعد اپنے اشعار کے ہیں

حزمین	بقید آب و گل اے جان تا توان جوئی درین کہن نفس اے سدرہ آشیان جوئی	دلاجہ بستہ این خاکدان برگزوان ازین حظیرہ بردن پر کہ مرغ عالم جانی	رومی
حزمین	زالال خضر ترا سینہ چاک می طلبید نفس گداختہ دنبال کاروان جوئی	ہمی رسد ز سموات ہر صبا نہایت کرہ بری بہ نشانی چو گردہ بنشانی	رومی
	تور شک یوسف مصری فتادہ در چہ تن تو بار کنگر عرشی بہ خاکدان جوئی	تو یار خلوت نازی مقیم پردہ رازی قرار گاہ چہ سازی درین نشین فانی	

حزین

تو شمع محفل انسی بہ تیرہ دھشت گاہ
تو مرغ عالم قدسی ندیم مجلس انسی

رومی

توزیب مسند قدسی برآستان چونی
دریغ باشد اگر تو درین مقام بانی

خیالات میں جو توافقی اور بیان میں ہم آہنگی ہے، محتاج بیان نہیں، بعض جگہ ایسا توارد ہے کہ حزمین کی جگہ کوئی اور ہوتا، تو مدح کی بجائے قدح ہوتی مگر اس سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ مولانا کی غزل کے زیر مطالعہ آنیکے بعد حزمین نے اپنی غزل کہی،

محاسن کلام حزمین

کلام حزمین کی خصوصیات میں آپکی مضمون آفرینی، نازک خیالی، استعارہ آمیز و مجازی تعبیرات ہیں آپنے اخلاقی درس بھی دیا ہے، لیکن کم، شیخ کی جس غزل کو لیجئے، اسکا ہر شعر و لولہ انگیز ہے، ابھی سامع

ایک ہی شعر کی نازک خیالیوں سے کافی طور پر لذت اندوز نہیں ہو لیتا، کہ دوسرا شعر نظر کے سامنے آتا ہے، جس میں حوادث بیان، ندرت فکر و جدت خیال اور سلامت عبارت پائی جاتی ہے، دل لوٹ جاتا ہے، پھر مسلسل ایسے ہی اشعار آتے ہیں اور سامع پر ایک عجیب و جدا انگیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے، میرے اس دعویٰ میں حزمین کی بدیہ گوئی کی مثال پڑے جو انکی سطور میں لکھی جا چکی یا چہر ”ازین حسرت کہ سجزانے مباد اور کین باشد“ والی غزل پڑھئے، شیخ کے محاسن افکار کو عنوان ذیل کے ماتحت رکھ سکتے ہیں

ز تاراج بہارالست و رنگیں جلوہ می آئی
خاں بود کہ جوشان خون گلزار است از دست

نازک خیالی

پہلے محبوب کے دست حنا شدہ کا تصور شرط ہے، اب غور کیجئے کس لطیف طریقہ سے اس مہندی کے رنگ کا خون

گلزار کی ریزش بتائی، رعایت لفظی بذات خود ہے، ”تاراج بہاران“ کو ”بربادی عزیزان“ سمجھ لیجئے اب معنی صاف ہے، کہ دست محبوب میں جو حنائی رنگ دیکھتے ہو وہ غالب مرحوم کے مرقیہ ”انکے تاخون ہوئے محتاج حنا میرے بعد“ کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ تو ان محویان الفت کا خون ہے جھینم تپش عشق نے درجہ شہادت عطا کیا،

خرام ناز تو اسے شوخ گل قیامت را
بناک عاشق خونیں کفن فرو ریزد

”عاشق خونین کفن“ اور ”گل“ میں جو رعایت معنوی پائی جاتی ہے، وہ ظاہر ہے، قیامت تک خونین کفن عاشق کی قبر میں ”خرام ناز“ کا اثر قابل داد ہے، میرے خیال میں شیخ صاحب ”عاشق خونین کفن“ کے قبر کو ”خرام ناز گل“ کے بدل ”رنگ گل“ کا منت کش بتاتے تو زیادہ اثر آفرین ہوتا، قبر عاشق میں خرام ناز کا اثر صرف عشقیہ عقیدہ مند ہی ہے غالب بھی فرماتے ہیں ”خون ہے دل خاک میں احوال بتان پرینی“

مگر افگندہ لعل آبدارش از نظمی را کہ اشک حسرت از دیدہ بیامانہ می آید

معتوق کا لب لعلین سے پیالہ شراب جدا کر دینا اور اس لئے دیدہ بیامانہ سے اشک ریزی منظر یہ شاعری ہے، اور مجھ جیسے ”زادہ خشک“ یا ”پختہ وضع زادہ خام“ سے اسکی تشریح ہو نہیں سکتی، اور اگر صرف ایک فلسفی کی طرح صرف تصور اور

تخیل سے کام لے کر نقشہ لفظی پیش کیا جائے، تو کمین حریفان دردِ آشام کی بارگاہ سے ”باحیب نشینی و بادہ پیائی“ کا فتویٰ نہ صادر ہونے لگے، جو کچھ بھی ہو، شیخ صاحب نے یہاں بڑی لطافت تخیل سے کام لیا ہے، قاعدہ ہے کہ جب پیانہ شراب منہ سے جدا کرتے ہیں، تو کچھ لب و دہن اور کچھ پیانہ سے چھلک کر شیشہ کے بالائی سطح پر آ جاتا ہے، اور وہ کنارہ پیانہ سے قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکتا ہے اب شعر کے الفاظ پر غور کیجئے، حنین نے پیانہ کی یہ حالت دیکھ کر نتیجہ نکالا ہے کہ پیانہ کی یہ تراوش اسکی اشک ریزی ہے، جسکی علت یہ ہے کہ محبوب نے اسے اپنے لبِ حل سے جدا کر دیا ہے

تجلی زار می بنم سر خاک شہیدان را مگر شمع بہ طوف مشہد بردان می آید
خاک شہد کا تجلی زار ہو جانا اس بنا پر ہے کہ زندگی میں تو پر دانے طواف شمع کیا کرتے تھے، اب انکے جلنے بجھنے کے بعد شمع ہی طوف بردانہ کرنے آ رہی ہے

وحدت فی الکثرت | عکسِ راست کہ دارد ہمہ جاہلو حین چہرہ بردار در آئینہ ایجاد یکست
یہ رنگ سخن رومی کی خصوصیات کلام میں ہے، ذات باری کے متعلق سورہ نور کی آیت حنین کے تخیل کو واضح کر دیتی ہے، المصباح فی الزجاء آخ

عالم عرفان | نقاب زلف زعارض اگر براندازی صنم ز طاق دل برہن فروریزد
ہی تو موسیٰ سے بنی اسرائیل نے بھی کہا تھا، لیکن فومن لک حتی غوی اللہ جھوٹا فرق صرف یہ ہے کہ حنین کے یہاں مسئلہ کائناتی سطح ہے، اور بنی اسرائیل کے یہاں منصفیانہ مرقع حسرت | گل می شود دختدان نالیدن بلبل را از زاری ما جانان بیزار نہاید شد
حنین کہ بخبر از خود ز خود خبردار است ترا کہ با خودی از خود خبر نمی آید
اخلاقی سببی

فراموش می کند مارا بوصلت چون رقص شد شود بیگانه از یاران دنی چون دلت یابد
اتمہ حالات و کلام شیخ محمد علی حنین | ابھی تک شیخ کے حالات زندگی اور تنقید کلام کے متعلق مینے کلیات حنین مطبوعہ نولکشور کا ایک پرانہ نسخہ سامنے رکھ کر اور صرف اپنی کاوش و جستجو اور ذوق تنقید پر اعتماد کر کے لکھا ہے، لیکن شیخ کی شخصیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اسے صرف انفرادی رائے پر منحصر نہ رکھا جائے، لہذا ضرورت ہوئی کہ تاریخ اور سیرت کے متعلق ان کتابوں کی ورق گردانی کی جائے جو شیخ کے عہد میں لکھی گئیں یا بعد میں لکھی گئیں لیکن مصنف نے واقعات کی ترتیب اور کلام پر رائے زنی کرنے میں اپنی صحت ذوق اور نکتہ شناسی کا ثبوت دیا ہے، اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل کتابیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں جن کے مطالعہ کر نیک بہ اثر ہوگا۔ اس عہد کی زندگی

سانے آجاتی ہے، جب وہ ہندوستان کی مذمت میں سرگرم اور اسکے بعض ارباب سخن سے برسرِ مجادلہ تھے، اور اخیر عمر تک یہی حالت قائم رہی۔

ماخذ اور بعض تذکروں پر تنقید | تذکرہ شعرائے فارس کے سلسلہ میں تقریباً چالیس کتابیں پائی جاتی ہیں جن کے قلمی نسخے اور نیٹل لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں، ان میں چند تذکروں کے سوا جن میں تذکرہ شعرا دولت شاہ، عرفات العاشقین مصنفہ قلی اوحدی البلبانی اور نفاۃ الانس جامی بھی شامل ہیں، قریب قریب تمام تذکروں میں شیخ حزمین کے متعلق کم و بیش تاریخی اور تنقیدی واقعات ملتے ہیں، لیکن تاریخی واقعات کی جستجو میں معاصرین کے بیانات ترجیحی پہلو رکھتے ہیں، لہذا ریاض الشعر مصنفہ علی قلی خان واغستانی متخلص بہ والدہ، مجمع النفایس مصنفہ سراج الدین علی خان اردو ید بیضا مصنفہ غلام علی آزاد بلگرامی کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی، یہ تینوں ارباب فضل و کمال شیخ کے معاصر تھے، صرف یہی نہیں بلکہ شیخ کیساتھ والدہ واغستانی اور آزاد بلگرامی گہرے تعلقات تھے، شیخ جب ہندوستان میں تشریف لارہے تھے، تو اتفاقاً والدہ واغستانی بھی ساتھ ہو گئے، اور بندرعباس تک دونوں کا ساتھ رہا، دہلی میں آئے تو کچھ دنوں والدہ کے بیان شیخ ٹھہرے بھی اور جب لاہور میں زکریا خان بہادر دیر جنگ صوبہ دار نے شیخ کی ایذا رسانی کا ارادہ کیا، تو والدہ نے اپنے بھائی حسن قلی خان کاشی کو جو محمد شاہ کی طرف سے نادر شاہ کے دربار میں سفیر بن کر گئے تھے، اور اس زمانہ میں لاہور کے اطراف میں پہونچ چکے تھے، لکھا کاشی کو ساتھ لیتے آئیں چنانچہ خان موصوف شیخ کو صحیح سالم ساتھ لائے، غلام علی آزاد بلگرامی جب سیوستان سے واپس آ رہے تھے، تو شہر بکھر میں شیخ سے ملاقات ہوئی، اور برطعت صحبتیں رہیں، اسی عارضی ملاقات میں شیخ جیسے نازک مزاج فارسی الاصل میریسی ہندی نثر ادیب سے کچھ ایسے مالون ہو گئے کہ اپنے قلم سے اپنے چند اشعار لکھ کر آزاد بلگرامی کو روانہ کئے، وہ اشعار یہ تھے:

پیش از ظہور جلوہ جانانہ سوختیم آتش بے سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

نگر و درغ طوفان کشتی بے لنگر عاشق بود دریا نمک پر درودہ چشم تر عاشق

بہ جلوہ ہائے راسر فراز می آئی مگر ز غارت عمر دراز می آئی
گہر بہ خلوت خاص صدف نمی آید چنین کہ در دل اہل نیاز می آئی

جب آزاد مرحوم ید بیضا لکھ رہے تھے تو شیخ دہلی میں تھے

سراج الدین علی خان آرزو ہندوستان میں شیخ کے ادبی معرکہ آرائی کے حریف مقابل تھے، دہلی میں دونوں کا ساتھ رہا لیکن ہے شیخ کی نازک مزاجیوں اور جذبات انانیت نے خان آرزو کو صحبت شیخ سے روکا ہو لیکن دوہم مذاق معاصرین کا ایک ہی نہیں لے ریاض الشعر جلد اول ص ۵۷ ید بیضا۔

رہنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دولوں نے ایک دوسرے سے ملاقات کی ہو، خان آرزو، ایک ہندوستانی تھے اور شیخ کے حریف مقابل لہذا شیخ کی اس سچوہ شاعری کی داد نہیں ضرور دینا تھی جس نے خان آرزو اور شیخ کی زندگی کو لازم و ملزوم کر دیا اور ایک تذکرہ نویس کے لئے ناممکن ہے کہ شیخ کے حالات زندگی بیان کرنے میں، دو خان آرزو کا تذکرہ نظر انداز کر دے، اس سے میری مراد خان آرزو کی کتاب تنبیہ الغافلین ہے، جسے خان موصوف نے شیخ حزمین کی سچوہ شاعری (متعلقہ ہند) کے جواب میں لکھا ہے آئندہ سطور میں، میں یہ بتاؤں گا، کہ خان آرزو نے تنبیہ الغافلین لکھتے وقت جب شیخ دہلی میں تھے، تو کوئی مناسب و لہجہ اختیار کیا تھا، اور جب وہ مجمع النفائس لکھ رہے تھے اور شیخ بنارس میں جا کر عزت گزین ہو گئے تھے تو خان آرزو کے خیال میں کیسی بے باکی، اور اظہار میں کیسی حریت آگئی تھی، مجمع النفائس، ریاض الشعراء کے بعد کی تصنیف ہے بعض ایسی باتیں جو تذکرہ بالاتذکرہ میں نہیں پائی جاتیں مینے غلام ہمدانی مختصص بہ مصحفی کی کتاب خدثا اور محرم الغرائب مصنفہ احمد علی ہاشمی سندیلہ سے لی ہیں، لیکن باوجود کاوش و تاریخ کی کتابوں سے مصحفی کی روایت کی تصدیق نہ ہو سکی، عہد محمد شاہی کی تاریخ میں شیخ حزمین کا تذکرہ نہیں پایا جاتا، عہد محمد شاہی کے ایک اہل قلم نے ”تاریخ محمد شاہ“ کے نام سے، محمد شاہ کی حکومت کے ابتدائی عہد کی تاریخ لکھی ہے، جو پٹنہ اور نیٹیل لائبریری کی فہرست کتب فارسی میں نمبر ۱۳۴ کے مقابل مندرج ہے، یہ قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں یہ کتاب اپنے ایک باری دوست (جبکہ نام بھی مندرج ہے) کی فرمائش سے لکھی ہے، اس میں حزمین کا تذکرہ نہیں ہے، ہاشم مخاطب بہ خانی خان نے منتخب اللباب نامی ایک کتاب لکھی اور بارہ سے لیکر محمد شاہ کے زمانہ تک تمام تاریخی واقعات قلمبند کئے، یہ عہد مغلیہ کی ایک نہایت مستند اور معتبر تاریخ ہے، لیکن باوجود درج کردہ اس میں حزمین کے متعلق ایک لفظ بھی نہ مل سکا، اسی طرح محمد علی خان انصاری مصنف بحر الموان نے تاریخ مظفری کے نام سے عہد مغلیہ کی ایک قابل اذ تاریخ لکھی اور اس میں تذکرہ شعراء کے متعلق ایک عنوان قائم کر کے شعراء متقدمین اور متاخرین پر ایک سرسری نظر ڈالی چنانچہ اس ضمن میں ابوالعلا گنجوی اور خاقانی کے تعلقات، شاہ اسماعیل کے ساتھ امیر معزجی (شاعر) کا عشق، اور تیرکھا کر جان دینا عہد اکبری میں محمد حسین نظیری کا ورود ہند، ابراہیم عادل شاہ کی سلطنت اور فارس سے نور الدین ظہوری کی آمد فیضی اور عرفی کے مطالبات، تمام واقعات پر روشنی ڈالی لیکن حزمین کا تذکرہ نہیں طرفہ یہ کہ شیخ حزمین کے حریف مقابل سراج الدین علی خان آرزو کے حالات زندگی اور تصنیفات کے متعلق کسی قدر تفصیلی واقعات لکھے، لیکن وہ ان بھی حزمین کے متعلق ایک لفظ نہ لکھا، الغرض عہد محمد شاہی کی ان تمام تاریخی کتابوں میں حزمین سے بے اتفاقی کی گئی، براؤن نے لطیری ہسٹری آف پرشیا جلد ۳ میں ایک جگہ مسلسل، اور دو تین جگہ سرسری طور پر حزمین کے کلام اور زندگی پر تبصرہ کیا ہے، براؤن کے نزدیک مشاعرے سے مشاعرہ تک فارس کی تمام تاریخ میں نہایت خشک ادبی دور ہے، اس زمانہ میں اگر کوئی مشہور کلام منصفہ ہو

لے ریاض الشعراء دیباچہ تنبیہ الغافلین ص ۱۵ مجمع النفائس

آیا تو وہ ہاتھ اصفہانی کا ترجیح دہندے، جسکے متعلق پروفیسر موصوف نے ایک عالمانہ بحث کی ہے، اور نمونہ کلام پیش کیا ہے، اسکے بعد براؤن لکھتے ہیں کہ اس دور کے تاریخی حالات ہلوگ دونہایت مستند اور کامل اہل قلم کے زانوں میں پاتے ہیں، یہ شیخ محمد علی حنین اور لطف علی بیگ متخلص بہ آذرہین، دونو شاعر تھے اور سابق الذکر بڑے پایہ کے شاعر تھے چونکہ انھوں نے اپنے کلام کے تین یا چار دیوان مرتب کئے تھے، اسکے بعد پروفیسر صاحب اپنا ذاتی خیال لکھتے ہیں کہ ہلوگوں کے نقطہ نظر سے انکی شریکار علی نظم سے زیادہ قابل وقعت ہے، ۱۳۳۵ء میں شیخ حنین نے مدت اکبر نام سے شیخ بہاؤ الدین عالمی کے کشکول کی طرح ایک مجموعہ تیار کرنا شروع کیا، لیکن افغانوں کے ہاتھ سے اصفہان کی غارتگری میں شیخ کے کتبخانہ کے دوسری کتابوں کی طرح یہ نسخہ بھی ضائع ہو گیا، اسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے، پروفیسر موصوف نے دوسری جگہ خاندان صفویہ کے عروج و زوال کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے علی حنین کے بعض خیالات کا (جو انھوں نے تذکرۃ الاحوال میں ظاہر کئے ہیں) جو شہینوس کی کتاب ”بحر اخصر میں برطانوی تجارت کی تاریخی سرگزشت“ اور کروسکی کی کتاب ”تاریخ انقلاب فارس“ کے نظریات سے موازنہ کیا ہے۔

اس ابتدائی عرصہ کے طے ہو جانے کے بعد اب میں بہ عنوان ذیل اُن واقعات پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جن کے متعلق حنین نے اپنے تذکرہ میں یا تو ذکر ہی نہیں کیا یا تفصیل سے نہیں لکھا، دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ شیخ حنین نے اپنا تذکرہ ۱۳۵۵ء میں ختم کیا اور مندرجہ ذیل واقعات مابعد کی تصنیف میں ملتے ہیں

شیخ زاہد اجمیلانی کی شخصیت | اگلے اور اُن میں لکھا جا چکا ہے، کہ شیخ نے اپنے اجداد کے سلسلہ میں زاہد اجمیلانی کا تذکرہ کیا ہے اور اسکے متعلق مزید واقعات نہیں لکھے، تذکرہ نویسوں نے بھی عموماً اس طرف توجہ نہیں کی، صرف براؤن کی کتاب لطیری ہسٹری آف پرتیا جلد ۲ اور مجمع التالیف جلد اول میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے شیخ صفی الدین اسحق بن شیخ امین الدین جبریل الموصوفی، سلسلہ صفویہ (حکمران فارس) کے مورث اعلیٰ تھے، آپکا نسب حضرت موسیٰ کاظم سے ملتا ہے، آپکا وطن اردبیل تھا، حنین کے جد امجد حضرت شیخ زاہد اجمیلانی حضرت صفی الدین کے پیر و مرشد تھے

ملہ عرفات العاشقین مصنفہ تقی اوحسی البلبانی (قلمی نسخہ اور قلمی لاٹری پرنٹ) ہفت اقلیم امین احمد رازی (قلمی) ملہ آردیل کا بانی کیانی فاندن کا مشہور بادشاہ کبخر دین کیا کؤس ہے یہ شہر کوہ سیلان کے دامن میں واقع ہے، اب وہاں بہت سرد ہے، یہاں کوہ سیلان سے پانی آتا ہے، جو بہت ہاضم ہو کر تلے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کے آدمی بڑے کھانہ والے ہوتے ہیں، یہاں کے اکثر باشندے سنی شافعی کے پیرو اور شیخ صفی الدین کے مرید ہیں کوہ سیلان کے اوپر ایک مضبوط قلعہ ہے، جسے ”درہم دژ وین“ کہتے ہیں، فردوسی شاہنامہ میں لکھتا ہے کہ جب کبخر دژ اور فیا برز میں بادشاہی کیلئے نزاع ہوا تو اسی قلعہ کی فتح پر فیصلہ قرار پایا فرا برز اسے فتح نہ کر سکا کبخر نے فتح کر لیا اور بادشاہی اسی کو ملی۔

(نزہت القلوب حمد اللہ المستوفی قلمی نسخہ)

چنانچہ خان آرزو یاقتی اوحسدی نے جہاں اپنے تذکرہ میں شیخ صفی الدین کا ذکر کیا ہے، وہاں یہ لکھا ہے، کہ گو تاریخ سے ثابت نہیں کہ آپ نے شعر گوئی کی ہو لیکن یہ، اشعار آپ کی طرہ منسوب ہیں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حزمین کے جد امجد حضرت زاہد البجلانی کی کیا شخصیت تھی؟

شیخ ”اصغفانی“ مشہور ہیں لیکن آپ کا آبائی موطن لاهیجان تھا، جسکی حزمین کا موطن آبائی اور اسکی جغرافیائی حالت

صرف یہ لکھا ہے کہ یہ گیلان کے شہرون میں سے ایک شہر ہے، لیکن عوام کو خود گیلان کے متعلق بھی کم واقفیت ہے، لہذا ضروری ہے کہ گیلان کے جغرافیائی حالت کے متعلق چند سطور لکھ دیئے جائیں

صاحب عجائب البلدان لکھے ہیں:-

”گیلان ولایتیبت نزدیک بہ قرین و بحر خرد در جانب شمال آنست رود بار و اشجار بسیار دارد و باران بسیار شود، و گوئید تا چہل شانہ روز آنجا باران منقطع نہ شود و چون باران بسیار شود در شب بانگ شغال بشنوند و بعد ازان بانگ سگ، مردم یک دیگر را بشارت دم ندبہ اقطار باران داین بسیار بہ تجربہ معلوم شدہ است“

عجائب البلدان میں لاهیجان کا تذکرہ نہیں پایا جاتا، لیکن امین رازی نے ہفت اقلیم میں گیلان ان کے ماتحت لاهیجان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

گیلان ایک ولایت ہے، جسکے اطراف میں پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے، وہاں تقریباً تین ماہ تک پانی برستے، یہاں کے لوگ اپنی اصطلاح میں دریا کو ”سپید رود“ کہتے ہیں اور چونکہ سپید رود گیلان کے درمیان میں جاری ہے، اسلئے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، ایک حصہ کو ”پیشہ پیش“ اور دوسرے کو ”پیشہ پس“ کہتے ہیں، سابق الذکر حصہ کا دار الملک لاهیجان ہے جو ایک آباد اور گنجان شہر ہے، دوسرے حصہ میں شہر شدہ آباد ہے، جسے زشت بھی کہتے ہیں“

اسکے بعد امین رازی نے وہاں کے طرز معاشرت کے متعلق ایک مختصر تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ وہاں کی لڑکیاں بڑی شوخ اور طناز ہوا کرتی ہیں، اور بازاروں میں ایک ادائے بے باکانہ کیساتھ محو خرام ناز رہتی ہیں، جب کوئی شخص کسی لڑکی کا خواستگار ہوتا ہے، تو وہ پھر بازار میں نہیں آتی، مولانا گیلانی فرماتے ہیں:-

دخترانے کہ ساکن رشداںند
ہمچون طاؤس مست می گزدند
طلب مشتری بہ ہر بازار
بند تنبلان بدست می گیرند

سہ جمعہ انعامیں جلد دوم عرفات الماشقین جلد دوم صفحہ ۱۵۷ ہفت اقلیم شدہ امین احمد رازی (قلمی نسخہ)

حزمین نے اپنے تذکرہ میں کہیں یہ واقعہ نہیں لکھا اسکے راوی صرف ایک تذکرہ نویس، غلام ہمدانی متخلص بہ مصحفی ہیں، انکے علاوہ کسی دوسرے تذکرہ نویس نے اس واقعہ پر روشنی نہیں ڈالی، حزمین دہلی میں عمدۃ الملک امیر خان کے دولنگہ پر ٹھہرے ہوئے تھے اسوقت خود محمد شاہ حزمین سے ملنے آئے لیکن حزمین نے ملنا پسند نہ کیا۔

شاہی ظیفہ اور ملاقات حزمین کیلئے محمد شاہ کی تشریف آوری

بارہ فردوس آرا مگاہ خواستند کہ آن بزرگ، لاپیش خود طلبیدہ خطے از کلام و سہ بردارند زہار قبول نہ کرد، چون استغنائے حراج صے بر باد شاہ عالم پناہ با حسن و صبر ہویدا شد خود یک دو بار سوار شدہ قصد مشرکاء ہش کرد شیخ از آمد اطلاع یافتہ یہ ہمانہ بہ زیارت خواجہ قطب الاقطاب بختیار کاکی پیش از آمدن پادشاہ سوار شدہ در رفت چون کہ چنین اتفاق افتاد طاقی الطرفین قلمین صورت نہ گرفت بالآخر یہ سبب منادی کشتن از زبان سخن چینیان و غوغائے حریفان از دہلی بر آمدہ در بنارس رفتہ کج عزت اختیار نمود۔

ایک دوسری روایت احمد علی ہاشمی سندیدہ بیان کرتے ہیں،

عمدۃ الملک نواب امیر خان خبر مقدم شیخ یافتہ برائے ملاقاتش رفت و شیخ را بہ نیاز تمام مہمان خود ساخت، خدمت نیکو یہ تقدیم رسانیدہ ملازمت بادشاہ کنیدہ جاگیر مبلغ پچھل ہزار روپیہ نزدیکی اکبر آباد پرانیش گرفت از مردم نقہ شنید کہ بادشاہ مزبور مبلغ پنج لک روپیہ بہ معرفت نواب مزبور بہ شیخ عطا فرمودہ

لیکن ساتھ ہی مجمع التفائیس میں سراج الدین علی خان آرزو لکھتے ہیں،

دروغیکہ عمدۃ الملک امیر خان ہا دمردم از آدابہ حضور آمد شیخ بہ توقع قدر شناسی رجح القہری نمودہ بہ شاہجہان آباد ہا ز آمد چند گاہ دیگر ضل کیما و عفا متوازی درین شہر بود و غرض گناہی اشتیاق افزائی مردم است دین چین بخش مدد و اقبال یادری کرد عمدۃ الملک قریب بست لک دام جید از بادشاہ برائے او گرفت پس جمعیت ہی کو گزیدہ

ان تینوں مختلف روایات کی تطبیق بہ ظاہر بہت مشکل ہے، نہ معلوم مصحفی نے یہ واقعہ کہاں سے لیا، حزمین نازک مزاج سہمی لیکن ایسے بے نیاز نہ تھے، اگر بادشاہ تشریف لائیں اور وہ ملاقات سے اعراض کریں یہ تو ایک نازک دنیا درویش کر سکتا ہے، نہ کہ ایک شاعر، ہاں خسرو دہلوی نے درباری تعلق سے علیحدگی کر لی، خاقانی نے منوچہر شروران شاہ کی ملازمت ترک کر دی، لیکن یہ ہوسقت جب محبت الہی کا جوش پیدا ہوا اور عزت نشینی کی طرف طبیعت مائل ہوئی، حزمین کی زندگی نے ہنوز یہ پہلو اختیار نہیں کیا تھا، لہذا

لہ عقد ثریا سلمہ حزمین اندر باب جلد اول (تلمی) مجمع التفائیس جلد اول سلمہ تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۱۱

مصنفہ عن الملک شجاع بن خلیل رقی

معلوم ہوتا ہے، حزن نے ثقہ شخص سے روایت نہیں لی، اس کے علاوہ صاحب مخزن الغرائب سے اس کی تردید بھی ہو جاتی ہے، چونکہ حزن عمدۃ الملک سے ملے ان کے بیان ٹھہرے، انھوں نے بادشاہ سے ملایا، دربار سے وظیفہ دلایا، خان آرزو کی روایت سے طنز کی ہو آتی ہے، جو رشک سے خالی نہیں، خان آرزو کے نزدیک شاہجہان آباد میں حزن اسلئے آئے کہ امیر خان قدر رشک کے حالانکہ صاحب مخزن الغرائب کی روایت بھی یہی ہے، لیکن انھوں نے اسی واقعہ کو دوسرے پہلو سے بیان کیا ہے، اور خان آرزو نے اپنے جذبہ عناد میں واقعہ پر دوسرے پہلو سے روشنی ڈالی ہے، جس سے حزن کی خفت اور سنگی مقصود ہے، حزن دوبارہ شاہجہان آباد میں آئے ضرور لیکن یہ کیا ضرور ہے، کہ امیر خان کی قدر شناسی ہی کی امیدیں آئے معلوم ہوتا ہے، میر خان نے جو قدر شناسی کی وہ خان صاحب موصوف کو گران گزری اور آپ کا یہ جذبہ ایک رشک آمیز حسرت کیساتھ اس ادائے بیان سے ظاہر بھی ہوتا ہے،

”چون بخش و اقبال یادری کو عمدۃ الملک قریب بہت لک دم جید از بادشاہ برائے او گرفت پس جمعیت می گزرا نید“

آخری جلد میں جو جذبہ کا رفرما ہے، ارباب بصیرت سے مخفی نہیں، اگر امیر خان حزن سے ملے انہیں اپنا مہمان کیا بادشاہ سے ان کی ملازمت کرائی، وظیفہ مقرر کر دیا تو اس سے یہ نتیجہ کمان نکلتا ہے، کہ حزن ایک گداگر کی طرح ہاتھ پھیلائے ہوئے دہلی دوڑے آئے، خان آرزو ایک بڑے پایہ کے ادیب اور مستند راوی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ واقعہ انھوں نے یوں بیان کر دیا کہ دوسرے تاریخی روایات سے تضاد نہ ہو لیکن نتیجہ ایسا نکالا، کہ عوام میں غلط فہمی پیدا ہو جائے، احمد ہاشمی کی روایت کا بھی ٹھنص دہی ہے، جو خان آرزو نے لکھا ہے لیکن استنتاج میں دونوں دورا میں اختیار کی ہیں

ہندوستان کی سچو اور ارباب کمال سے محرکہ آرائی | گزشتہ اوراق میں امین شیخ کے ان سنجوہ خیالات پر روشنی ڈال چکا ہوں جو انھوں نے تذکرہ میں ہندوستان اور اہل ہندوستان کے متعلق ظاہر کئے تھے، قیاس اور رائے کی بنا پر ان کے اسباب پر بھی ایک حد تک روشنی ڈال چکا ہوں، والدہ واعستانی اور خان آرزو نے اس کے متعلق شرح و بسط سے بحث کی ہے، میں نے صرف قیاس پر اعتماد کر کے نتیجہ نکالا تھا، عجیب اتفاق ہے کہ بعض واقعات کی تائید جگہ ماتحت میں بحث کی تھی، تذکروں سے بھی ہو جاتی ہے، یعنی تین عنوان کے ماتحت بحث کی تھی، لسانی انقلاب، سیاسی سچیدگی اور مذہبی اختلاف،

صاحب جمع النعائیس لکھتے ہیں:-

”کیسے چنانکہ قدر اور بزرگواران وقت نہ شناخت۔ نادر شاہ در دہلی مسلط شدہ بود و شہر دہلی بہ تصرف

تشنون اور آہ۔ (حزین) زرگوشہ خزیدہ بود بعد رفتن افواج شاہی باز ظاہر شد

پھر فرماتے ہیں:-

”از بسکہ طبع ناسازہ دارد دشن و غربت برو کی ان اسف“

میرے ایک عنوان سیاسی پیچیدگی کی تو خان آرزو کے خیال سے تائید ہو گئی خان موصوف نے دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ شیخ خشک طبع، اور ناملسا رکھے ہی اسوجہ سے لوگ انکی طرف زیادہ متوجہ نہیں،
خان آرزو نے یہ خیال کسی معاندانہ جذبہ میں نہیں ظاہر کیا ہے بلکہ والد واعسانی بھی جو شیخ کے دوست اور ندیم تھے، فرماتے ہیں:-

بادشاہ وامر اوسا نراس کمال محبت و خراعات نسبت بہ دے مرغی می و ایند لیکن ازا انجا کہ مروت جبلت و انصاف ذاتی شیخ است عموم اہل این دیار از بادشاہ و ہر ادغیرہ جو ہائے رکیک کہ لایق شان شیخ نہ بودہ، از وہ ہر چند اور از این ادائے زشت منع کردم قایدہ نہ بخشد و تاحال در کار راست لا بپایاس نمک بادشاہ و حق صحبت لہر و آشنایان بے گناہ گریان گرشدہ ترک آشنائی و ملاقات آن بزرگوار نمودہ

روایت بالا سے ظاہر ہے کہ والد واعستانی کے نزدیک بھی شیخ ایک بے مروت انسان ہیں اور انھوں نے نہایت بے انصافی کے ساتھ ہندوستانیوں کی مراعات کا یہ جواب دیا، کہ ہجو کہنے لگے، والد واعستانی نے انھیں اس سے منع کیا لیکن شیخ اس پر بھی باز نہیں آئے، آخر کار والد کو بھی اسکا بچ ہوا، اور انھوں نے شیخ سے ترک تعلق کر لیا، چنانچہ اسپر خان آرزو نے چٹکی لی۔ فرماتے ہیں:-
.... عالی جاہ خان شفقت نشان علی قلی خان داعستانی کہ مستعد و مخلص حنین است و حال سور ڈا براۃ

دوستی شیخ حفظ کردہ۔۔۔۔۔

والد اور خان آرزو کے خیالات کی تائید، خود شیخ کے ملفوظات اور کلام سے بھی ہو جاتی ہے، چنانچہ جہان اپنے والد کی وفات کا تذکرہ فرماتے ہیں وہاں انکی اس وصیت کو بھی نہایت اہمیت سے لکھا ہے، کہ ”ہر چند اوصاف و دنیا را بردق مرام نہ بینی بیعت و دنیا را بردی اختیار نہ کنی“ عالم سے بے نیازی، خلق ظاہری کی افسردگی زود رنجی، بے محابا اظہار خیال یہ تمام باتیں شیخ کی سیرت میں داخل تھیں، جسکا ایک پہلو مفصلہ ذیل اشعار سے بھی نمایاں ہو جاتا ہے،

حریف عیش جہان بے دماغ می ماند پیالہ می رود از دست و داغ می ماند

بہ سفلہ عالم افسردہ با دار زانی خزان چون گشت گلستاں بہ زاغ می ماند

زخوے آتش عشق غیور بوالبعی است کہ آشیانہ بلبل بہ باغ می ماند

ہندوستان ہندو اہل ہندوستان پر عمومی حیثیت سے شیخ نے جو اپنے ہجو یہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ایک حد تک مفصلہ

ذیل اشعار میں بھی موجود ہے

بہ ہند گشتہ زمین گیر نا توانی ما رسیدہ است بہ شب روز زندگانی ما

سواد ہند خاطر خواہ باشد بے کمالات را نماید خاتمہ تاریخ روشن چشم عریان را

زہند تیرہ دل چون شمع روشن گردون رقم
نہ گشت آلودہ پستی ہمت دامن پاکم
بہ من نگذاشت دوران سبک سزوت پانے
چون شمع بزم کوران تا کیے ہیودہ بگذارم

بیائے خود باین بزم آدم از سر بردن رقم
ازین عالم چون خورشید بلند اختر بردن رقم
چون موج از سینہ زین دریائے بے لنگر بردن رقم
حزین از کشور گردون دون پروز بردن رقم

صرت ہی نہیں بلکہ عمومیت سے گزر کر شیخ نے ذاتی حلقے ہی کے، جسکا نتیجہ یہ ہوا، کہ خان آرزو نے ایک سالہ سہمی بنیہ انخافلین لکھا اور شیخ کے کثیر التعداد اشعار کے نقایص لفظی و معنوی پر عالمانہ بحث کی چنانچہ والد و اعستانی لکھتے ہیں۔

بعض از غیوران این مملکت کمر انتقام بستہ، نتیجہ بجا بروئے کشیدہ در نظر ارباب خرد و خفیفش کردند، از جملہ سراج الدین علی خان آرزو کہ از شعر لے این شهر است و در فضیلت و سخنوری گوئے از میدان ہلکان می باید اشعار غلط بسیار از ویوان شیخ بر آورده رساله سہمی بہ تمیہ انخافلین نوشت و ابیات مزبور ایک ایک ذکر کردہ تعریضات نمودہ

ذکر کردہ تعریضات نمودہ

اسی طرح میر محمد عظیم ثبات ابن میر افضل ثبات نے شیخ کے دیوان سے بروایت والد واغستانی پانچویں اور بروایت خان آرزو دو سو ابیات نقل کئے اور انکے مقابلہ میں متقدمین کے اشعار پیش کر کے بتایا کہ شیخ نے سرقہ کیا ہے ان میں زیادہ تر صائب کے اشعار پائے جاتے ہیں جنہیں میر عظیم ثبات نے حزن کا ماحذ قرار دیا ہے، اسکی رویداد دو طریقہ سے بیان کیجاتی ہے، والد واغستانی کا بیان ہے کہ کسی شخص نے ایک موقع پر میر افضل ثبات کا کوئی شعر لکھ کر شیخ سے پوچھا، شیخ نے جواب دیا کہ مضمون جو گرا ہوا ہے وہ تو درکنار ہے، یہ فلان شاعر کا خیال ہے، جس سے میر افضل نے سرقہ کیا ہے، میر عظیم نے یہ رقعہ دیکھ لیا انکی رگ حیمت جوش میں آئی اور انھوں نے بھی شیخ کے کلام کی نظیر پیش کیں، اور بتایا کہ ان میں فلان فلان متقدمین سے سرقہ کیا گیا ہے، لیکن خان آرزو فرماتے ہیں کہ جب نواب شیر افگن خان بسر غیرت خان، میر محمد افضل کی شاگردی میں داخل ہوئے تو انھوں نے نگینہ میں یہ

۱۷۱۰ء میں شیخ نے سفر ہندوستان کیا، اور اسی سال میں وفات پائی، یہ درمیانی زندگی ہندوستان میں گزری تاریخ سے بہت نہیں چلتا کہ انھوں نے ہند سے فارس کا سفر کیا ہو، لیکن برائون نے بغور کے ترجمہ ”تذکرۃ الاحوال“ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حزین نے تہیہ کر لیا تھا کہ فارس کے سیاسی انقلاب اور اختلال کے باوجود، ہند سے لوٹ جائیں (طرزی ہسٹری آف ہرشیا جلد تین ص ۱۷۱) جو کہ جیسے تذکرۃ الاحوال ۱۷۱۰ء میں تمام کیا لہذا نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ اشارہ اسی زمانہ میں کے کیونکہ اسکے بعد وہ فارس جانیکے بجائے بنارس میں چلے گئے ۱۷۱۰ء ریاض الشرحۃ خان آرزو نے مرثیہ مذکور کو دیا ہے، لیکن ریاض الشرحۃ میں یہ اشارہ بھی مندرج ہیں ۱۷۱۰ء ریاض الشرحۃ -

مصرعہ کندہ کرایا تھا اسے

شیر افکن خان مرید ثابت دوست

جب میر افضل کا انتقال ہو گیا تو خان موصوف نے شیخ علی حزمین کی شاگردی اختیار کر لی اور ایسے معتقد ہوئے کہ خان آرزو لکھتے ہیں ”اعتقاد ہے کہ مافوقش تصور بنودہ بہم رسانند“ یہی وجہ ہوئی کہ میر محمد عظیم نے تعصب میں آکر شیخ کے کلام پر رد و قدح کی اور دوسو ابیات کو حقد میں کے کلام کا مسروقہ بتایا، شیخ نے اہل کشمیر پر بھی تعریضیں کیں، چنانچہ وہ بھی شیخ سے اچھے اور انھوں نے مقابلہ لکھے مگر بلا ساطع وغیرہ کو مستند رکھا۔

خان آرزو کی تنبیہ الغافلین پر ایک سرسری تبصرہ | خان آرزو نے جب تنبیہ الغافلین لکھی شیخ دہلی میں تھے، اور یہی وجہ ہے کہ خان آرزو کا لب و لہجہ بھی ایسا نرم تھا، گو یا وہ شیخ

کے سامنے نمودار نہ بیٹھے ہیں، اور اپنے شکوک دفع فرما رہے ہیں کہا جاسکتا ہے کہ خان صاحب موصوف کا بہ حسن اخلاق تھا کہ انھوں نے یہ ادائے بیان اختیار کیا لیکن میں کو نکاح کہ نہیں یہ شیخ کے کمالات کا رعب اور اسکی شخصیت کا اثر تھا اور یہ خیال اس واقعہ سے اور بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے، کہ خان آرزو مجمع النفائس لکھ رہے تھے اسوقت شیخ بنارس میں اقامت گزین ہو گئے تھے جب بارعب حریف سنے سے ہٹ گیا اور اسکی ہدیت کا اثر دل سے کم ہو گیا تو خان صاحب موصوف کے خیالات میں ایسی جرأت آگئی کہ گو یا وہ حزمین کو ایک ناقابل التفات چیسر تصور کرتے ہیں اگر حسن اخلاق کے اثر سے خان صاحب نے تنبیہ الغافلین میں اس ظاہر دارانہ استرشاد اور ملمع آمیز انگسار کا اظہار کیا تھا تو اسکا موقع ہر وقت تھا، خان صاحب نے مجمع النفائس میں حزمین کے متعلق جو ادائے بیان، اظہار خیال، لہجہ طرز اختیار کیا ہے اسے دیکھنے کے بعد خاقی صاحب کے ساتھ تنبیہ الغافلین کے دیباچہ کی نسبت اتہام سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی یا پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حزمین ایسی بارعب شخصیت رکھتے تھے کہ انکی موجودگی میں خان آرزو جیسے بلند پایہ شاعر اور نکتہ رس عالم بھی ”حریف جوشش دریا نہیں خود داری ساحل“ کا مصداق تھے۔

خان آرزو تنبیہ الغافلین کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

”درین ایام مطالعہ دیوان باغت بنیان جناب فصاحت آب شعر لے اوج نکتہ پردازی دبیر فلک سخن سازی
بقیۃ السلف حجتہ الخلف، نتیجہ متقدمین وخاتم متاخرین شیخ محمد علی متخلص بہ حزمین کہ تحفینا از مدت وہ سال بہ سبب
ہنگامہ ایران وارد ہندوستان جنت نشان کہ داخلش صحت و خلد کا پناہ ایسا کوایا است گردیدہ از طغیہ شاعرش
گوش اکابر و صاغر پر گشتہ اتفاق افتاد، واستفادہ تمام دست تہیم داد لیکن در بعض اشعار کہ بہ سبب تصور دہن
بمعانی آن نرسیدہ، و قایم بہ قصد آن نہ گردیدہ، از رد دے رودادہ ناچار در تحریر آن را بروئے قلم مشوش رقم خود

مجمع النفائس ص ۱۲ مخزن الغرائب ۱۲

کشادہ و نیر بارہ از مصاح شعرا کہ از نارسائی فہم خویش نارسا قہیدہ گاہے باندک تغیر و تبدیل گردانیدہ و گاہے خود گفتہ، پس این از عالم خطائے بزرگان گرفتہ کہ در واقع خطائے بزرگیت تصور نہاید فرمود:۔۔۔۔۔ امید کہ اگر بہ نظر شریف لا در آید از خلل و زلل برآید“

اسکے مقابلہ میں مجمع النفائس کے ان طنزیہ اور تذقرون کو ملاحظہ فرمائیں جو جستہ جستہ خان آرزو نے لکھے ہیں، چند گاہ دیگر شل کیما و عفا متوازی این شہر بود و عرض از گنای، شقیات افزائی مردم است و بس۔۔۔۔۔ رسالہ شتل بر حسب و نسب و سیر و شعر خود نوشتہ و عویائے بلند در ان نمودہ کہ صاحب داعیہ از ان معلوم می شود۔۔۔۔۔ ورنیو لا بہ عزم حج و زیارت عتبات کہ روانہ نگاہ شدہ بود، از عظیم آباد برگشتہ بہ بنارس کہ مسجد عظیم ہند فان است فردکش کشتہ

ترسیم کہ بہ کچھ نہ رسی اے اعرابی کین رہ کہ تو میردی بہ ترکستان است

۔۔۔۔۔ شیخ گوید کہ این دیوان کہ شہرت دارد دیوان چارم است و سہ دیوان در ذرت افانغت تلف شد ہر حال دیوان مذکور ہم کہ مکرر بہ مطالعہ درآمد بہ آن وجہ کہ مظنون شتیق شیخ و جماعت نصیریان اوست نیست اگر این ہم بہ آن سہ ملحق می گردید، مورد این ہمہ اعتراضات نمی گردید۔۔۔۔۔ می گویند کہ شیخ مذکور فاضل است و صاحب تصانیف لیکن بیچ از دور علم حکمت و کلام بہ نظر در نیامد

نتیجہ ظاہر ہے، ساتھ ہی خان آرزو نے شیخ کے حکمیہ اور کلامیہ تصنیفات کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے، ممکن ہے حکمت اور کلام کے متعلق شیخ کی کوئی تصنیف انکی نظر سے نہ گزری ہو، لیکن ان فنون کے اوپر یقیناً انھوں نے تصنیفات چھوڑی ہیں جبکہ مختصر حال اپنے ”تذکرۃ الاحوال“ میں بھی درج کر دیا ہے، شیخ کے بارہ رسائل کا ایک مجموعہ پٹنہ کی انڈیل لائبریری میں موجود ہے، جس میں رسالہ ”حدوث و قدم“ رسالہ صیدیہ، رسالہ فرستامہ، شرح قصیدہ لامیہ، رسالہ معاد وغیرہ ہیں، تذکرہ بالا رسائل پر مبنی ایک سرسری نظر ڈالی ہے، اور مجھے شیخ کے کمالات علمیہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

خان آرزو نے حزمین کے کلام پر جو جرح کی ہے، وہ بعض جگہ صریح بھی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ شیخ ایک قابل اور نکتہ رس شاعر نہ تھے، شیخ کی شاعری لہجہ نہ تو تھی نہیں، کہ انکا کلام فطری اور معنوی ربط، اصولی اور فردوی قیود تحسینی اور منطقی دقیقہ سنجیوں کے اعتبار سے ذرہ برابر بھی گرا ہوا نہ ہوتا سرخوش اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ صاحب تبریزی نے بابا فغانی کے مندرجہ ذیل شعر کے مصرعہ اول پر تھرت کیا،

چو شبنم صمد نالان ز گلگشت چمن فتم نہادم روئے بردے گل از خوشن رفتم (فغانی)

صائب نے کہا ”بجائے ”نالان“ بہ مناسبت شبنم لفظ گریان“ باید اگر مصرعہ اول را بہ این طور خواند خوب است

لہ ریاض الشعر ائمہ مجمع النفائس سہ فہرت کتب علمی فارسی انڈیل لائبریری پٹنہ (۱۹۶۷ء)

جو شبنم صمد گریان گلگشت چمن رقم

اسی طرح حزمین نے اپنے تذکرہ میں ملاحظہ کاشی کے جس شعر کے اوپر اپنے والد کی جرح کا حال لکھا ہے وہ اگلے اوراق میں لکھا جا چکا ہے، ملاحظہ کاشی عہد صفویہ (فارس) کے ایک زبردست اور بلند پایہ شاعر گزرے ہیں اور انکا وہ شعر جس پر حزمین کے والد شیخ ابوطالب نے جرح کی ہے، اس قدر مشہور ہے کہ مورخین نے مختصر کے کلام کا نمونہ پیش کرنے میں اسے درج بھی کیا ہے، ہر چند شیخ ابوطالب کی جرح اس اعتبار سے صحیح ہے، کہ ان کے نزدیک شعر کچھ طور پر نہ بڑا گیا، اسے قناعت بلند قدان در کند تو، کوگون نے بڑا تھا، حالانکہ مختصر کاشی کے اصل شعر میں ”قناعت بلند“ کی جگہ ”گردن بلند“ ہے اور صرف اس ایک لفظ ”قناعت“ اور ”گردن“ کے رد و بدل سے لطافت معنوی میں آسان زمین کا فرق ہو گیا ہے، گردن بلند، کو ملحوظ رکھنے کے بعد ابوطالب کی جرح کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

افرض جرح سب پر ہو سکتی ہے، تنقید آسان ہے، لیکن سخن آفرینی مشکل چیز ہے،

حزمین ۱۔ ظلمتکہ عاشق را از چہرہ منور کن تا چند بروز آرم تار کی شبہا را
آرزو ۲۔ شب بروز آرد دن صبح است نہ تار کی شب بروز آرد دن با شبہا می بایست گفت
یہاں مجھے آرزو سے اتفاق ہے، اصل محاورہ دہی ہے جو خان آرزو نے لکھا ہے، رات سے دن ہونا محاورہ صحیح ہے تار کی شب سے دن ہونا محاورہ نہیں،

حزمین ۲۔ ہر چہ خواہی مکن از دوری دیدار مگو وحشت آباد مکن خاطر دیرانی ما
آرزو ۱۔ وحشت آباد کردن خاطر دیران چہ لطف دارد اگر خاطر جمع یا خاطر آبادی بود گنجایش داشت و اگر گوئید کہ عاشق را با جمیعت خاطر چہ کار گوئیم درینجا معشوق مخاطب است و خطاب جز در حالت وصل صورت نمی بندد و جمیعت خاطر در وصل متصور است۔

اس شعر میں خان آرزو نے جرح تو صحیح کی لیکن تمثیل میں نفسیاتی اعتبار سے خود غلطی کر رہے ہیں خان صاحب نے نہایت صحیح فرمایا، کہ خاطر دیران کو وحشت آباد کوئی تمثیل ایک فضول چیز ہے ویرانہ تو خود ہی وحشت آباد ہوتا ہے اسکے بعد یہ فرماتے ہیں کہ ”میرے قول پر یہ جرح ہو سکتی ہے کہ عاشقوں کا دل تو خاطر جمع ہوتا نہیں تو میں یہ کہو گا کہ اس شعر میں معشوق مخاطب ہے، اور خطاب صرف حالت وصل ہی میں کیا جاتا ہے، لہذا دل کو خاطر جمع کہنا مناسب تھا“ خان صاحب نے ”خاطر جمع“ کی اصلاح دیکر، اور اس جرح کو اپنے سرفرض کے البتہ خود کو مجروح کر لیا ہے، ورنہ انکی جرح اپنی جگہ پر صحیح تھی، خان موصوف صرف یہ کہہ سکتے تھے کہ ویرانہ کو وحشت آباد کہنا صحیح ہے، اور بس بات ختم تھی اب انھوں نے جرح کو طول دیا، اور فرماتے ہیں ”خطاب وصل میں ہوا کرتا ہے، اور اسوقت ”خاطر دیران“ کی جگہ حزمین ”خاطر آباد“ کہہ سکتے تھے“ لیکن ظاہر ہے کہ

۱۔ جمع التفاضل ۲۔ مخزن الغرائب

خیالات اور نفسیات کی دنیا میں خان آرزو کے نظریہ کے خلاف بھی ہوا کرتا ہے، اگر وہ تصور کی نیرنگیوں کے القابات مراقبہ کے مظاہر جذبہ رسا اور شوق ناپیدا کنا کے رموز پر غور کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ بحرین بھی وصل کا طبع ہے، اور جو کہ نفس ایک طرف طلالِ سہرے شکیف اور دوسری طرف وصل خیالی کی لذت آفرینیوں سے لذت اندوز ہوتا ہوتا ہے، اسے مستحق کو مخاطب کر کے بھی ”خاطر ویران“ کا شکوہ ادا کیا جاسکتا ہے

حزین :- ازہمت سرستان بردار حزین خضرے تنہا نتوان رفتن صحرائے محبت را
آرزو :- ”خضر برداشتن“ عبارت تازہ است خضر از عالم زاونیست کہ بردارند و گر گویند کہ ”رفیق برداشتن“ ڈیڑھ آمدہ گوئیم ہمراہ ”برداشتن“ است نہ تنہا ”برداشتن“ در محاورہ آمدہ گوئیم ہمراہ ”برداشتن“ است نہ تنہا ”برداشتن“ و بر تقدیر تسلیم خضر حکم رفیق نیست یعنی استعمال ابن لفظ در حق تبوع جائز نیست

بیان خان آرزو کے دو اعتراض ہیں، ایک فطری دوسرا منطقی جب وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ”خضر برداشتن“ بہ مندرجہ ”رفیق برداشتن“ ہے، اور زبان کے اعتبار سے اس میں کوئی نقص نہیں تو اب انکی یہ اعتراض ہوتا ہے، کہ لفظ خضر کے ساتھ ہی ”بردار“ بھی ہونا چاہیے، تھا خضر اور ”بردار“ کے درمیان میں دو ایک لفظ کا حامل ہو جانا ظاہر کرتا ہے کہ محاورہ زبان کے خلاف ہے، اسکا جواب یہ ہے کہ اگر یہ نقص ہے جیسا کہ علامہ بلاغت و معانی نے لکھا ہے، تو صرف حزین ہی اس کے مجرم نہیں بلکہ شیخ سعدی بھی اس کے مجرم ہیں، بوستان کا پہلا شعر ہے،

بنام جهان دار جان آفرین حکیم سخن بر زبان آفرین

یقیناً ”سخن آفرین“ ساتھ ہونا چاہیے، ورنہ ضعف التالیف کا الزام عاید ہوتا ہے، مگر جب سعدی جیسے بالکمال نے اسے منظور کر لیا تو حزین کے سر پر عیب نہیں معلوم ہوتا،

خان صاحب موصوف کی دوسری جگہ معنی سے متعلق ہے، افسوس اچھلنے سے محابا یہ تو لکھ دیا کہ ”خضر حکم رفیق نیست“ رفیق خود خضر کا تبوع ہے لہذا ”خضر بردار“ کا فقرہ تبوع کو بولنا جائز نہیں، اگر خان موصوف کا یہ منطقی استنتاج کسی لفظ کا منت کش نہیں تو نعوذ باللہ تعالیٰ اعتراض قرآن مجید کے سروراد ہوتا ہے

الہدالی الملامن نبی انشائیں من بعد موسیٰ اذ قالوا للنبی اھمنا ابغث لنا ملکا الخ

یقیناً بنی اسرائیل تبوع تھے، اور انکا بادشاہ انکا محکوم نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی بنی اسرائیل ”ملک بردار“ کا فقرہ بول رہے ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا تھا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ اوٹھا اور حزین کے شعر سے خود ہی ”خضر برداشتن“ کا معنی پیدا ہوتا ہے، مبنی کہ نگاہ کہ ایسا نہیں بیان ”ہمت سرستان“ کی قید لگی ہوئی ہے خان آرزو نے غالباً ”ہمت سرستان“ کا پایہ نہیں سمجھا، ”خضر برداشتن“ کے لئے ایک درمیانی کڑی موجود ہے جس نے بنی اسرائیل کے ”العبث لنا ملکا“ کے لئے ”نبی“ کی درمیانی کڑی ہے، لہذا اس آیت سے خان آرزو کے اس خیال کا رد ہو جاتا ہے کہ

ہند کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ارباب جہل اور مخالفین کی تعداد کے باوجود ان کے قدر شناسوں کی ایک جماعت ہوگی جسکے اثر محبت نے آپ کو مجوس کشت رکھا، اور تذکروں سے یہ بات ثابت ہوگئی، عمدۃ الملک امیر خان کے اطاف، بادشاہ کے وظائف، شیر افغن خان کی عقیدت، آزاد بلگرامی کے جذبات شیخ آیت اللہ شناسی جیسے بلند پایہ شاعر کا تلمذ یہ ہیں ایسی نہ عقین جو شیخ کو گر ویدہ نہ بنا لیتیں

عبدالملک آروی

لہ جمع الغایس - سید بیضا سہ عقد ثریا - ۱۲

عسکریہ کا ایک کایا پلٹ ہیر آریل ہیرت اینڈ سون

کھنے کو صرت تیل ہی لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے کبھی کبھی بات کرتا ہے تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود بناتی دیکھا دلی جزا سے جدید اصول پر تیار کیا گیا ہے جسکی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانوں نے کی ہے فواید کی تفصیل مختصر شہارین نامکن پر مختصر اور کچھ عجیب کہ گھر میں اسکی بیشی کھنا گویا بست ہر مرض کو دفع کر دینا ہے اگر نہ سر یا چند یا کے بال گر گئے ہیں یا گر رہے ہیں۔ یا بانخورہ اور گنج ہو گیا ہے اگر نہ۔ نزلہ درد سر یا شقیقہ، دوران سر، ضعف دماغ و ضعف بصر یا خوابی یا نسیان کی شکایت ہے اگر نہ۔ سر اور جسم کی بھوڑ یاں، پھنسیان، گرمی دانے، خارش یا دیگر امراض جلدی کا دفع کرنا مقصود ہے اگر نہ۔ کٹھ مالا ریل اور دق وغیرہ سے محفوظ رہنا ہے۔

تو ان سب کا واحد علاج کایا پلٹ ہیر آریل ہے

جو نہ صرف خوشبو بلکہ اپنی مقدار و وزن کے لحاظ سے بھی بازار کے تمام خوشبودار تیلوں سے اچھا اور ارزان ہے ڈاکٹر تیج بہادر لکھنؤ نے اپنی تحریر میں تصدیق فرماتے ہیں کہ اس تیل کے فواید شہار کے مطابق پائے گئے ہیں اور مرزا جعفر علی خان صاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر رائے بریلی نے دوائی آرڈر بہرہ ایک شیشی کا دیدیا ہے مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ یکم نیاز نے تمام گرسے ہوئے بال از سر نو پیدا ہو رہے ہیں اور بہت گھنے جو ابی امور کے لئے جو ابی کارڈیا ٹکٹ ضروری ہے

قیمت معہ محصول (پتہ)
 دو شیشیوں کے خریدار سے معہ محصول ہے
 منیجر کایا پلٹ ہیر آریل لکھنؤ

مصور کا ناتمام شاہکار

(ایک فسانہ)

(۱)

نواب جمشید یار کی کوٹھی عین دریائے جن کے کنارے تھی۔ ایک طرف تاج اور دوسری طرف جتنا کی چادر سین آنکھ کی فرحت اور دلی سرور کے لئے کافی سامان ہم پہنچاتے تھے نواب صاحب نے اس قطعہ کو صرف اسی نظارہ سے لطف اندوز ہونے کیلئے خرید لیا تھا۔ مین جس کمرہ میں ٹھہرایا گیا تھا وہ وسعت کے لحاظ سے گو مختصر تھا مگر میری ضروریات کے لئے بالکل کافی تھا۔

نواب صاحب کے ملازم نے بتایا تھا کہ یہ کمرہ خود نواب صاحب کی پرائیوٹ نشست گاہ کا کام دیتا تھا اسوجہ سے اسے نسبت دیگر کمرہ کے زیادہ سجاایا گیا تھا عمدہ فرنیچر قیمتی ساز و سامان اور دلکش آرائشی تصاویر سے کمرہ کی تزئین کی گئی تھی۔

کمرہ کے ارد گرد کھلی الماریاں رکھی ہوئی تھیں جن میں بیش قیمت کتابیں، قلمی دستاویزات و مکتوب، رسالوں اور اخباروں کے قابل قہرے سے سلسلہ دار رکھے ہوئے تھے۔ ہر الماری کے تحت پر اسکی فرست چسپان تھی جتنا چھ مجھے یہ معلوم کچھ مین مطلق وقت نہ ہوئی کہ نواب صاحب کی تاریخی کتابیں کس الماری میں رہتی تھیں اور اسکی فرست کن کن کتابوں پر مشتمل تھی۔

نواب صاحب اپنے داماد شہر بارہادر کے ہمراہ شکار پر گئے ہوئے تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ مین ان کے دولت کدہ پر انکی عدم موجودگی میں حاضر ہوا تھا لیکن ان کے خوش خلق ملازم جانتے تھے کہ مین ان کا عزیز ترین دوست ہوں اس لئے کوٹھی میں میری آمد کی خبر فوراً پھیل گئی اور ہر ایک نے مجھے گرجوشی سے بلایا کہ پھر نہایت پر تکلف کھانے کے بعد مجھے باعزاز اس کمرہ میں پہنچا دیا گیا جہاں کا مین نے ابھی ذکر کیا ہے

رات ہو چکی تھی مگر نہ معلوم دس بجے جانے کے بعد بھی مجھے کیوں نیند نہ آئی اس وجہ سے ارادہ کیا کہ بجائے پلنگ پر لیٹے لیٹے وقت ضائع کرنے کے کچھ دیر مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ غنودگی پیدا ہو جائے اس خیال سے پلنگ پر سے اٹھا اور تاریخ کی الماری کے قریب پہنچ کر ایک کتاب منتخب کی اور واپس آ کر پڑھنا شروع کر دیا

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا زوال میرے لئے ایک عجیب و غریب موضوع کا باعث ہوئی اور مین اس کے متعدد صفحات پر حکم جید مسرور ہوا۔ میری عادت ہے کہ دوران مطالعہ میں ہر پر گراف کے بعد نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہوں تاکہ نگاہ کو آرام ملے حسب وقت مین اس عمل کو کئی بار کر چکا تھا کہ ایک دفعہ میری نظر کتاب پر سے ہٹ کر ایک بیضوی تصویر پر پڑی جو میرے پلنگ کے عین مقابل دیوار کے وسط میں لٹک رہی تھی اور جسے اس وقت تک مین

ندیکھا تھا

(۲)

سبز جھال کے برقی فانوس سے ہلکی ہلکی روشنی صرف میری کتاب پر پڑ رہی تھی اور کمرہ کا وہ حصہ جس میں تصویر لکھی ہوئی تھی تو کامل تاریکی میں تونہ تھا مگر پھر بھی جھال میں سے چھٹک چھٹک کر کچھ روشنی اسپر پڑ رہی تھی جو نبی میری نظر تصویر پر جا کر ٹھہری میں نے ہاتھ سے کتاب رکھ دی اور غور سے تصویر دیکھنے لگا تصویر ایک نوجوان حسین لڑکی کی تھی۔

تصویر کینوس (Canvas) پر بنی ہوئی تھی۔ صاحب تصویر کا چہرہ گردن، شانہ اور نصف سینہ دکھایا گیا تھا۔ بازو اور لمبے لمبے بال تاریک ”فضائے بید“ (Space) میں غیر محسوس طریقہ سے جذب کر دئے گئے تھے اور یہی وہ صنعت تھی جو تصویر کو جالب توجہ بنا دیتی تھی۔ تصویر کا فریم بیضوی تھا اور نہایت قیمتی مطلقاً نقش و نگار سے مزین مصوری میں معمولی شد بکے سوا مجھے اور کچھ لگاؤ نہ تھا مگر اس تصویر کی ظاہری کشش اور رنگوں کی آمیزش آنکھوں میں کچھ اس طرح کھٹی جا رہی تھی کہ بے اختیار ہی جا ہا کہ اسے قریب سے جا کر دیکھوں۔

چنانچہ میں پلنگ پر سے اٹھا اور تصویر کے پاس گیا۔ ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنا شروع کیا آنکھوں میں خار بادہ کی سی مستی، رخساروں پر شہاب کی سی سرخی ایسی خصوصیات تھی کہ جنھوں نے مجھے تھوڑی دیر کیلئے مہووت بنا دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر اس تصویر میں کیا دلکشی تھی جو اس قدر جالب توجہ واقع ہوئی تھی۔ میں نے بہت سے بالکال مصوروں کے نقوش دیکھے تھے مغل، بنگال اور پٹالی اسکول کے بہت سے بے نظیر نمونے میرے المیوں میں موجود تھے اور گو خود کبھی تصویر کشی نہ کی تھی مگر اوّل عمر سے تصویر اور نقاشی کا مدّح تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ فن سے ناواقف ہونے کے باوجود بھی ہر اس تصویر کو اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا جو مجھے اچھی معلوم ہوتی تھی میں کسی خاص اصول یا قاعدہ کا پابند نہ تھا بلکہ صرف جاذب نظر تصویر میرا عام معیار تھا یہی وجہ تھی کہ میرے پاس کئی تصویریں ایسی تھیں جنھیں ماہرین قطعی معمولی بتاتے تھے مگر میں نے صرف اس وجہ سے رکھ چھوڑا تھا کہ وہ مجھے ”اچھی معلوم ہوتی تھیں“

لیکن ایسی تصویر کبھی نہ دیکھی تھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ آخر اس تصویر میں کیا خوبی تھی کہ اس قدر مسحور کر رہی تھی۔ بہت دیر غور و تعمق کی نگاہ سے دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تصویر کی حقیقی خوبی صرف یہ تھی کہ وہ بالکل جاندار معلوم ہو رہی تھی تصویر نے مجھے پہلے بہت مسرور کیا پھر حیرت ہوئی اور تھوڑی دیر تک یہ حالت قائم رہنے کے بعد میرے منہ سے ”واہ“ نکلا اور اسٹول پر سے اتر پڑا۔

(۳)

میں نے الماری کے قریب جا کر اس جلد کو تلاش کرنا شروع کیا جس میں تصاویر اور نقوش کے متعلق تفصیلی حالات درج تھے

اور اس کا دل بیٹھنے لگا کیونکہ اسے آرٹ سے نفرت تھی مگر چونکہ نظر ثانیان مرغ اور مطیع تھی اسوجہ سے اپنے خاوند کے حکم کی تعمیل کے لئے آمادہ ہو گئی۔

”لوکی مصوّر کے سامنے ہفتون بیٹھ کر تصویر کھینچواتی رہی۔ مصوّر کو اس تصویر کے بنانے میں وہ لطف محسوس ہوا جو بیان سے باہر ہے اس نے اپنے موقع کی تمام شوخیان و ہیکلیان اپنی دلہن کو مصوّر کو نے میں صرف کر دین اسکا شوق و دلولہ دن دوئی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا جس وقت وہ لوکی کو سامنے بٹھا کر اور اپنے کینوس پر گردن جھکا کر موقع کو جنبش دیتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک غیر فانی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔“

”لوکی جسے آرٹ سے نفرت تھی اس جبر یہ حاضری اور مسلسل نشست کو برداشت نہ کر سکی اور کنول کی طرح مرجھانے لگی۔ اسکی صحت میں فرق آگیا چہرہ کی روشنی معدوم ہو گئی۔ رخساروں کی سرخی زردی مائل ہونی شروع ہو گئی۔ مگر وہ نہ صرف اپنے خاوند کا حکم ماننا چاہتی تھی بلکہ اسے مسلسل ٹکٹی باندھے دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔“

”وہ مصنوعی مسکراہٹ پیدا کر کے خوش نظر آنا چاہتی تھی مگر ایسا نہ ہو سکتا تھا اسکا دل بیٹھا جا رہا تھا مگر اپنے مصوّر کے شاہکار کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے مجسمہ بنی بیٹھی رہتی تھی۔ تصویر اب ختم ہونے کو تھی اور مصوّر خوش ہوتا تھا کہ اگر کبھی (خدا بخواتی) لوکی مر گئی تو وہ تصویر اس کے لئے ایک اچھی یادگار ثابت ہوگی۔ اب تصویر کا چہرہ، سینہ اور کندھے بن چکے تھے اور بال بنانے کے لئے صرف ایک ہفتہ کی اور ضرورت تھی مگر لوکی کی صحت اب اور بھی خراب ہو گئی تھی۔“

”مصوّر اپنے ذوق میں اسقدر منہمک تھا کہ بہت کم نظر اٹھا کر دیکھتا تھا۔ جب تصویر ختم ہونے کو آئی یعنی آگے اور لبوں پر صرف دو تین برشوں کی اور کسر رہ گئی تو لوکی کی صحت اس طرح خصل ہو گئی جس طرح شمع ٹٹماتی ہے اور بجھتے بجھتے رہ جاتی ہے۔“

دن بھٹے، اور سینے گز گئے، لوکی کے رخساروں کا رنگ تصویر میں بالکل اتر آیا تھا، آنکھوں کی چمک بھی پیدا ہو گئی تھی مگر مصوّر جس دہن میں تھا وہ یہ ظاہری اوصاف نہ دیکھتا تھا کسی طرح اپنی تصویر میں لوکی کی مسکراہٹ کو ابدی طور پر قفل کرے تاکہ وہ جس وقت تصویر کو دیکھے لوکی کو اپنی طرف مسکراتا ہوا پلے۔ اور یہی وہ مسکراہٹ تھی جس نے اس کے دل کو موہ لیا تھا!“

تصویر ختم ہو گئی تھی مگر صرف لبوں پر ایک برش کے ذریعہ مسکراہٹ پیدا کر لی اور باقی تھی اسوجہ سے اس نے برش بورڈ پر رکھا، پیالیاں ایک طرف علیحدہ کین اور کسی پر سے کھڑے ہو کر ایک انگڑائی لی اور زردیدہ لگا ہون سے تصویر کی جانب دیکھا۔

”آہ! اسقدر خوبصورت رنگ تھے، کیسی عمدہ شبیہ اتری تھی، معلوم ہوتا تھا کہ لوکی اب منہ سے بول اٹھتی لیکن صرف ایک کسر باقی رہ گئی تھی یعنی تصویر میں اسکی طبی مسکراہٹ نہ دکھائی گئی تھی اور یہ کچھ ایسا مشکل کام بھی نہ تھا صرف ایک برش کی حاجت تھی۔“

”مصوّر نے تصویر کی خوبوں کو سراہا اور بے اختیار ہو کر بولا! ”خوب! تصویر میں بذات خود زندگی ہے!“

کیا مسلمانوں کے تمام عقاید واقعی اسلامی ہیں؟

اس سے قبل ہم ایک مضمون میں بتا چکے ہیں کہ اسلام کو قومی مذہب بنانے میں کتنے نقصان ہیں اور یہ بھی دکھلا چکے ہیں کہ مسلمانان ہند کی جماعت کسی معنی میں ”قوم“ نہیں ہے بلکہ ایک مذہبی جماعت ہے۔ ہم نے یہ بھی دکھلایا ہے کہ اس غلط خیال کی وجہ سے مسلمانوں کی تنظیم جماعت میں سخت اتہری پھیل رہی ہے۔

اس مضمون میں ہم صرف مذہبی نقطہ خیال سے اس مسئلے پر بحث کریں گے کہ مسلمانوں کے عام عقاید و اعمال میں کس قدر دراصل

اسلام ہے اور کس قدر سیاست و معاشرت ملتی۔

ایک مسلمان کا بچہ جب پانچ یا چھ برس کی عمر کو پہنچتا ہے تو والدین کی پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے دینی تعلیم حاصل کرے محلہ کے میاں جی کے گھر کو لے جاتا ہے۔ جو اس کو ابتدائی قاعدہ شروع کراتے ہیں۔ اور اسکے بعد قرآن کا سارا متن دوتین سال کے اندر پڑھاتے ہیں۔ یہ گویا اولین مذہبی تعلیم ہے جو مسلمان کے بچوں کو دیا جاتی ہے۔ ہندو کا بچہ اتنے ہی زمانہ میں مدرسہ میں داخل ہو کر واقعی علم حاصل کرتا ہے۔ لکھنا پڑھنا اور حساب سیکھتا ہے۔ اور مدارس ثانوی کے قابل ہو جاتا ہے۔ بدقسمت مسلمان کا بچہ قرآن کے ختم کرنے پر بھی چھوڑ دیتا۔ اگر گلستان بوستان کی نوبت نہ آئے تو بھی دوتین سال تک اور اس کو غیر بانوس علم و زبان میں درس حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ اگر وہ اسکول میں بھی داخل ہوا تو اسکولوں اور کالجوں کے نتیجے برطانیہ رہے ہیں کہ تعلیمی رنگ و پونہ میں مسلمان کا بچہ ہمیشہ پیچھے رہا کرتا ہے۔ یہ بہت ہی شاذ بات ہے کہ مسلمان کسی امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو جائے یا دروس کی معلمین کی کرسیوں کا زینت ہو لیکن اگر آج کوئی مسلمان اپنی زبان سے یہ نکال دے کہ اس طرحی تعلیم سے کیا حاصل ہوا اور کیوں وقت ضائع کیا گیا تو مولوی یا تھل کر کے رہ جائیگے کہ افسوس آج اس متذکر کو سنگسار کرنے کا موقع حاصل نہیں ہے۔ لیکن آؤ ذرا ہم اسلام کے متعلق جانچ کر لیں کہ کیا واقعی یہ اسلام حقیقت میں وہی اسلام ہے جس کا حکم قرآن میں ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ دنیا میں اسلام کی کیا ضرورت تھی جبکہ پہلے یہود مذہب میں ہماری شریعت کی وہ ساری باتیں (کیا اعمال کیا اعتقاد) موجود تھیں یہود کا مذہب کیوں منسوخ اور نامقبول قرار پایا اور اس کی جگہ کیوں اسلام قائم ہوا۔ کون یہودی ایسا ہے جو خدا کے وحدہ لا شریک کا قائل نہیں یا انبیاء علیہم السلام کا۔ اگر کوئی مولوی موجودہ اسلامیت اور یہودیت میں فرق دکھلا دے تو میں بیشک قائل ہو سکتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائے

اسلام میں

ایسا

ہوتا

یہودیوں کے ہاں

۱۔ قربانی ایک فعل محمود اور پسندیدہ خدا ہے

۲۔ خدا کے اہل بیت میں سے کسی ایک کی تعظیم و تکریم ہونا ہے

۳۔ خدا کا نام لے کر کھانا کھانا

اسلام

ایضاً

ایضاً

ایضاً (دیکھو فتاویٰ مولوی

احمد رضا خان بریلوی)

ایضاً

ایضاً

ایضاً (دیکھو کتاب تقویۃ الایمان)

ایضاً

ایضاً

ایضاً حقیقہ

ایضاً

ایضاً قرآن کے منسوخ (دیکھو القرآن موطی)

قرآن کے علاوہ علماء نے بہت امور کو ناجائز قرار دیا

موسیٰ فنون لطیفہ، سہنا چاندی کا استعمال کرنا

اشاعت سنن بجائے قرآن

ایضاً

دارالحرب میں اسلام کا پھانا حرام

پچھلے دنوں مجھے ایک جید عالم سے خط و کتابت کا شرف ملا۔ بعض مسائل کے اختلاف پر میں نے انکی رائے پوچھی اور اس سلسلے میں میں نے انھیں یاد دلایا کہ ہم مسلمانوں نے درحقیقت اس وقت اپنے کو متخذ و ن من دون اللہ ام بایا کا پورا پورا مصداق کر لیا ہے اور ہماری ساری خرابیوں کا راز اس ہی میں ہے۔ اُجھا جواب سننے کے قابل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: لے متخذہ حقیقتاً۔ یہی وہ منہ علم کی تدبیر ہے کہ کوئی شخص خدا کا تمام احادیث کو لیا کر کہہ کر مسلمانوں کو ملکی دعوت دیکھائے۔

یہود

۳۔ آدمی ایک خاص قسم کے جانور کا گوشت کھانے سے ناپاک

اور بد مذہب ہو جاتا ہے۔

۴۔ عبادت میں کوئی خاص حرکت نہ کرنے سے عبادت باطل نامقبول

۵۔ غیر یہود سے سود لینا جائز ان کے مال کو خورد و برد کرنا اور انکی

عورتوں سے مباشرت کرنا جائز ہے۔

۶۔ صحت آسانی بغیر طہارت چھوٹا اور اس کا ترجمہ پڑھنا حرام

۷۔ ساحرہ زانیہ اور مرتد کو سنگسار کرنا۔

۸۔ غلامی کا جواز و آخسان

۹۔ مذہبی اعتقاد کا یہود قوم سے مخصوص نہ ہونا

۱۰۔ طہارت۔ زکوٰۃ۔ روزے کی باریک عملی تدابیر و دیگر چیزیں مخصوص

قواعد کی پیروی

۱۱۔ خستہ۔

۱۲۔ طلاق کی آسانی

۱۳۔ توریت کے احکام منسوخ ہوئے ہیں

۱۴۔ احکام توریت کے علاوہ انہوں نے بہت سے امور کو ناجائز قرار

دیا ہے۔

۱۵۔ مشائخ اشاعت بجائے توریت

۱۶۔ مذہب کو اسپرٹ سے کوئی واسطہ نہیں لفظی یہودی ضرورتی

اسلئے ہو سکتا ہے کہ بعض شرعی ادا میں غلطی تاویل کو بجائے

اور جواز کی صورت نکال دیکھائے۔

۱۷۔ یہود کی قوم کے علاوہ اشاعت مذہب ممنوع۔

معلوم ہوئے۔ لیکن اسکے مجموعہ احکام و مجموعہ فقہ کا یہ نہیں چلتا (غالباً مہدی آخر الزمان قرآن کو سمیٹ کر غارِ سامرا میں بیٹھ چکے تھے) امام شافعی نے کتاب الام میں اس فرقے کے ایک شخص کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”اس بارے میں کچھ لوگوں نے دو مذہب اختیار کئے۔ ایک فریق حدیث کو نہیں مانتا اور خود قرآن اس کے نزدیک کافی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص نماز و زکوٰۃ اس حد تک ادا کرے جس پر نماز و زکوٰۃ کا لفظ بولا جاسکتا ہے تو اسے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اسکے لئے کوئی دقت نہیں ہے اگرچہ وہ روزانہ صرف دو ہی رکعتیں پڑھا کرے اور جس معاملے میں قرآن کی کوئی ہدایت نہیں ہے وہ فرض نہیں ہے دوسرا فریق کہتا ہے کہ جس معاملے میں قرآن کا حکم موجود ہے اس میں حدیث قبول کر لی جائیگی، اس لئے جس معاملے میں قرآن کا حکم نہیں ہے اس کا قول بھی پہلے فرقے کے موافق ہے، اور نتیجہ بھی تقریباً دونوں کا ایک ہی ہے۔“ اس بنا پر اس فرقے کا بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے احکام کا مجموعہ مرتب کیے تاکہ اس پر بحث کی جائے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں اب تک صرف رد و قمع ہوتا رہا ہے۔ خود اس فرقہ نے اپنی ہستی کو بحیثیت ایک بانی فقہ جدید کے نمایان نہیں کیا۔“ وغیرہ

یہ عالم ربوبندی نہیں بریلوی نہیں فرنگی علی تہیں کہ انہی بات کو کوثرِ شریعہ سمجھا جائے یا اسپرِ مضحکہ کیا جائے بلکہ علامہ شبلی کے شاگرد رشید اذرعہ دینہ العلماء نے ”سراجِ امیر“ مگر ذرا دیکھو تو کیسی خدا لگتی بات کسی ہے کہ فرقہ اہل قرآن کا مجموعہ احکام و فقہ کیا ہے۔ سبحان اللہ اسپر بھی اگر کوئی یہ کہہ دے کہ مولانا آخر قرآن کیا پیچھے ہے۔ تو بتائیے کہ وہ مردود ہو یا نہیں۔“

تو خیر مجھے آپ فرقہ اہل قرآن کی سمجھ کر اصول اہل قرآن سن لیجئے۔

سب سے بڑا اصول اہل قرآن کا یہ ہے کہ قرآن سب سے زیادہ آسان کتاب ہے۔ نہ یہ مابعد البطیۃ کا فلسفہ ہے۔ نہ ریاضی کی کتاب کہ اسکے لئے تحقیق کی جائے۔ انسان جس کو خدا نے دو آنکھیں اور دو کان اور ایک صمیح و ماخ دیا ہے۔ وہ قرآن کے سمجھنے کا اتنا ہی اہل ہے جتنا ایک علامۃ اللہ تعالیٰ قرآن کے سارے احکام پر ہمارا عمل ہونا چاہئے۔ نہ اس میں کسی تاویل کی ضرورت ہے اور نہ کسی تفسیر کی اور قرآن کا سب سے عظیم الشان ریفارم یہ تھا کہ خدائی مذہب کسی خاص فرقہ یا قوم کی جائداد نہیں ہے۔ علی مذہب میں کسی خاص نسک (RITUALISM) کی خدا کو پروا نہیں اور نہ کسی برہمیت کی اگرچہ اس کے اور تم کو یقین ہو کہ تمہاری نماز وہی ہے جو رسول اللہ نے ادا کی تو پڑھو اور ضرور پڑھو۔ لیکن اگر خدا کی عبادت کسی اور طریقہ سے کر سکتے ہو تو وہی قرآن کا منشاء عبادت کے لئے اوقات کی تعیین وہی کی گئی ہے جسوقت فطرتاً انسان کو اپنے معبود کی طرف متوجہ ہونا چاہئے یعنی قبل طلوع قبل غروب اور عشا۔ زکوٰۃ برابر اور متواتر دیتے رہو اور جتنی ہو سکے۔ رمضان کے روزے جس میں بہت سی مصلحتیں ہیں ایام معدودات میں سے ہر ایک میں رکھو۔ اور نہ رکھو تو اسکی جگہ فیدہ دید و اپنے دنیاوی فوائد میں قرآن سے مشورہ لے سکتے ہو لیکن مجبور نہیں ہو۔ زمانہ اور ملک کا خیال رکھو۔ اصولاً اس چیز کو گناہ جانو جس سے تم کو یا کسی تمہارے ہم جنس کو جسمانی یا روحانی تکلیف پہونچے۔ اگر تم کو عربی نہیں آتی ہے تو قرآن کو اپنی زبان میں پڑھو۔ اور ہمیشہ یاد رکھو کہ شرک یا تقلید خواہ خفی ہو یا جلی وہ گناہ عظیم ہے اور ناقابل معافی ہے کیونکہ یہ چیز تم کو انسانیت کے مدارج سے گرا دیتی ہے اور تمہارا ایک

تمام نجات ہے۔ حالانکہ تمہاری ماؤں نے تم کو آزاد جنا ہے۔ اور زیادہ صراحت چاہو تو ہمارے فلسفہ مذہب کو دیکھو

یہ فرقہ کب پیدا ہوا اور کب تک دنیا میں رہا۔ تو اسکی تاریخ عجیب ہے۔

رمضان کی ۱۱ یا ۱۲ تاریخ ۱۲۹۹ھ کو پیدا ہوا۔ اور دو سو صدی تک جب تک عجم سے ایک باندھی قائم رہا بعضو خیال ہے کہ یہ وہاں اس طرح آئی کہ ایک بزرگ محمد ممدی نام اس فرقہ کی اصل کتاب بغل میں دبا کر سامرہ کے ایک غار میں بیٹھ گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کتاب کی اکثر آیتیں گاؤں خود ہو گئی اور بعض منسوخ التلاوة ہیں اور جو باقی بچی ہیں وہ ایسی چستانی ہیں کہ ان کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں رہا اس فرقہ کے ماننے والے چند بزرگ ہوئے ہیں جن میں سے زیادہ مشہور ابو القاسم محمد بن عبد اللہ (روحی فداہ) اور انکے اصحاب ہیں۔ مثل ابو بکر صدیق۔ عمر فاروق۔ عثمان فوسی النورین علی بن ابی طالب۔ لیکن خیال غالب یہ ہے کہ اس فرقہ کے لوگ اپنے کو ہمیشہ پوشیدہ رکھتے ہوئے پائے گئے۔ اور کبھی اپنے فرقہ کا اظہار نہیں کیا۔ اس واسطے کہ فریق ثانی ہمیشہ سیاسی قوت کے ساتھ غالب رہے۔ اگر ہمارے فرقہ کا کوئی آدمی ہمارے اصول کو اب بھی ذہن نشین کرے تو سب سے پہلے وہ یہ کرے گا کہ خواخواہ اپنی قوم سے لام بندی یا مورچہ بندی نہ کرے اپنی قوم کی پسندیدہ باتوں کو اپنی کتاب کے معیار سے ملا کر قبول کرے گا۔ اور مکر وہ باتوں کو چھوڑ دے گا۔ مگر اس فرقہ کا بچہ اسکول میں اس وقت جائیگا جبکہ اس قوم کا دوسرا بچہ جاتا ہے پھر پراگروہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے فرقہ کی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے باپ سے مذہبی عبادت کے طریقے یاد کرتا ہے۔ اس کے پاس اسکی یہ کتاب اس کی زبان میں ہوتی ہے جس کا وہ خود بھی مطالعہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسکو خود اپنی زبان پر عبور ہو جائے

لیکن ہمارے فرقہ سے باہر کا آدمی تو خدا ہی اسکا حافظ ہے۔ اسکے نزدیک صغیر سنی کی شادی ایسی ہی چیز بھی اسکے مذہب میں جایز ہے اگر اس کی قوم میں مانعت کیجاتی ہو تو وہ سب سے پہلے اس حکم کو توڑنے پر تیار ہو جائے اور پھر ساری وہ خرافات بائیں کرے گا جو انسانیت کے لئے باعث ننگ ہیں لیکن اس کے ساتھ اسکو مذہب کا ایسا غلو ہوگا کہ بقر عید میں ایک بکرے کی جگہ دو بکے کی قربانی کرے گا۔ شام کے وقت اپنی جائناز سڑک پر بچھا کر نماز پڑھے گا بڑی عمدہ داڑھی رکھے گا۔ ادبچا پانچا مہ بنے گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ گناہ اپنے سوا سب کو کافر اور بدین جائیگا جس نے اس سے آمین باجبر اور رنغ یدین میں بھی اختلاف کیا۔

مولانا کے اس سوال کا جواب کہ فرقہ اہل قرآن نے احادیث کا انکار کن وجہ سے کیا۔ اس کی سرگزشت نیکار کی آئندہ اشاعت میں درج کرونگا۔

سید مقبول احمد بی اے

ماہی کا جن شایع ہو گیا ہے، نمونہ طلب کرنے پر مفت روانہ کیا جاتا ہے۔ نیکار

مراق

(فسانہ)

”ات ات آہ آہ آہ“

میرا معمول ہے کہ میں مغرب سے کچھ پہلے چل قدمی کے لئے نکل جاتا ہوں۔ اور مغرب سے کچھ بعد واپس آ جاتا ہوں۔ کپنی باغ کے گرد ایک چکر یا چاندنی چوک کا ایک گشت یا پارسی تھٹر ٹیکل کپنی تک چل قدمی، میری صحت جسمانی میرے دل و دماغ کے لئے جس قدر منفعت بخش ہے اسکا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ مجھے آج تک نہ امیت دہار کی ضرورت پڑی نہ آتنگ نگرہ کو یون کی اہان تو جیسا کہ میں نے کہا، مغرب سے کچھ دیر بعد واپس آ جاتا ہوں۔ اس کے بعد دوستوں کی آمد یکے بعد دیگرے شروع ہو جاتی ہے اور بارہ بجے تک مجلس احباب بڑے زور شور سے گرم رہتی ہے۔ غالباً مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ صدر مجلس یہ خاکسار ہی رہتا ہے!

”ات ات آہ آہ آہ“

اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی یہ آواز میرے کان میں آئی۔ ہمدردی کے تمام جذبات، تیار داری کے تمام احساسات مجھ میں دفعتاً پیدا ہو گئے، میرا دماغ جلد جلد ان وسائل پر غور کرنے لگا۔ جو کسی کی تکلیف کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہو سکتے ہیں میری طبیعت میں فطرتاً یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ تکلیف کی ایک کراہ، کرب و اذیت کی ایک چیخ، درد کی ایک سسکی مجھے بیتاب و توجہیں کر دیتی ہے اور میں بغیر ایک لمحہ توقف کے اپنا دست امداد دراز کر دیتا ہوں۔ انسان تو انسان جانور و نیک کے لئے میری ہمدردیاں وقف ہیں حتیٰ کہ شب ماہ میں جس وقت کئے چاند پر بانگ زنی کرتے ہیں تو میں اس قدرت کے لئے دست برد عا ہو جاتا ہوں کہ چاند کو اسی وقت غروب کر دوں۔ ہر چند اس خیال کے ساتھ ہی چاند کے لئے بھی جی کڑھتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض حق پسند لوگ مجھے (Miserable creature) ہمدردی کا مجسمہ کے معزز نام سے پکارتے ہیں۔ اگرچہ میرا سمجھ حلقہ احباب کو تاہ نظری سے مجھے اس ”دہلی ہونے والی“ ہستی سے مشابہت دینے کی ناکام کوشش کرتا ہوں جسکا ”شہر کا اندیشہ“ زبان زد خاص و عام ہے۔ یوتوف کہیں کے

”ات ات آہ آہ آہ“

میں چھلانگ مار کر اندر پہنچا۔ میرے پانگ پر میرا عزیز ترین دوست حامد پڑا ہوا، ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں جلدی سے اس پر جھک گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ”حامد کیا بات ہے“ اور اسی کے ساتھ انداز غرور کے ساتھ میری نظر ان بے شمار ادویات پر گئی جن کو میں نے نہایت سلیقہ سے ایک الماری میں چن رکھا تھا۔ یہ وہ مجرب دیات

تھیں۔ جنگلے اشتہارات روزانہ ہندوستان کے معزز اخبارات میں نکلتے رہتے ہیں اور جب کاتیر کبھی خطا نہیں کرتا۔ اور اگر بغرض محال کبھی ناکامی بھی ہو تو پھر پیوچی عامل کریم الدین کے قنویذ تو اس قسم کے مواقع کئے اکیس کا حکم رکھتے ہیں!!

”ات ان“ ہائے مرگیا، مار ڈالا“ حامدا بکی اور دراز در سے چلایا اور پہلے سے زیادہ جلد جلد کروٹ میں بدلتے لگا۔ آخر بات کیا ہے“ میں نے پوچھا مگر مثلاً ایک خیال میرے ذہن میں آیا ”درا ٹھرو“ میں نے کہا ”میں خود معلوم کروں گا کہ کیا ہے میں آج تمہیں اپنی تشخیص کا قائل کر کے چھوڑ دوں گا۔ فرسٹ ایڈ کا مطالعہ میں نے بیکار نہیں کیا ہے“ ”ہائے ہائے۔ مٹ گیا تباہ ہو گیا“

میں نے ہمدردانہ نظروں سے اسکی طرف دیکھا۔ ایک منٹ تامل کیا۔ میں آثار و علامت سے مرض کا دماغی تفحص کر رہا تھا۔ دفعۃً میری نظر اکیس کے تازہ پرچے پر پڑی جو میز پر پڑا ہوا تھا۔ آج ہی میں اسکا مطالعہ کیا تھا۔ میں نے اطمینان و خود اعتمادی کا سانس لیتے ہوئے کہا ”تمہیں درد گردہ کی شکایت ہے“

”ہائے نہیں“ اور پھر اس نے کر وٹ بدلی

”نہیں“ میں نے حیرت سے کہا ”مگر میں نے آج ہی اسکی بحث پڑھی ہے اچھا درا ٹھرو۔ تمہارا نشانہ بھٹ گیا ہے“ اور میں نے ذرا متکردا و طلب نظروں سے اسکی طرف دیکھا۔

”نہیں نہیں بخدا نہیں آہ!“ اس نے بری طرح سے آنکھیں میچ کر اور منہ بگاڑ کر جواب دیا ”اچھا تو عارضۂ فتن کا دو پڑا ہو گا“ میں نے یقین کلی کے ساتھ کہا ”اس صورت میں آئہ ایریکٹس ایلکٹنا۔۔۔“ ”نہیں اس نے کر وٹ بدلتے ہوئے کہا ”تو تمہیں قبض ہو گیا ہے“

نہیں یہ بھی نہیں ہائے“ مجھے اسکی انکار اور اپنی تشخیص پر غصہ آنے لگا تھا

”افوہ میں جو کہ گیا تھا میں نے تمہاری آنکھوں کو اب تک نہیں دیکھا۔ تمہیں یقیناً یرقان کا مرض لاحق ہے“ اور میں نے دل ہی دل میں اپنی تشخیص کی داد لی

”اوہ، اوہ نہیں نہیں“ کم بخت نے پھر انکار کر دیا۔

میراچی چاہ رہا تھا اپنے کو اور اسے دونوں کو کچا جبا جاؤں۔ جیست کو دیکھو انکار کئے جا رہا ہے اور مجھے آج کیا ہو گیا ہے کہ کوئی تشخیص ٹھیک نہیں بنتی

ہا اکیسی اچھی اچھی زود اثر مجرب دوائیں رکھی ہیں مگر یہ بد نصیب کسی سے گھبی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ مجھے ایک ترکیب سوچی میں حریفانہ انداز میں اکثر کر بیٹھ گیا اور پوچھنا شروع کیا ”دہندہ“

”دہلین“

”جالا“ ”دہلین، آہ“ ”خارش“ ”نہیں“

”بچھونے کا نام ہے“ اور یہاں پاد پرفرین کرنے لگا کہ اتنی ذرا سی بات اب تک نہ سمجھ سکا تھا
”نہیں“ اس نے پھر انکار کر دیا

”داد“ ”نہیں“

”خنازیر“ ”نہیں“

”اورنگ زیب“ ”نہیں“

”کالا بخارا“ ”نہیں“

”بال توڑ“ میں نے ڈپٹ کر اس طرح کہا۔ جیسے یہ نام مجھے یاد نہ آتا تھا ورنہ میں شروع ہی سے کچھ گیا تھا کہ مرض کیا ہے۔
لیکن جب پہنچی اس نے نفی میں جواب دیا تو میں سرد ہو گیا۔ انشا کہ انسان ضعیف انسان کا علم کس قدر محدود ہے۔ خدای
ائین خدای جانے میں نے جھٹاکر کہا ”آخر منہ سے تو پھر لے کیا بات ہے؟“
وہ دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دین اور آہ سرد بھر کر کہا ”مجھے محبت ہو گئی ہے! راشد مجھے
محبت ہو گئی ہے“

”آہ تو یہ بات تھی۔ یہ بات تھی جو یسا تڑپا رہی تھی۔ میرا فرو شدہ جوش پھر ابھر کر اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ گیا۔ محبت
کے نام نے میرے اعصاب کے ساتھ وہ کیا جو مفرح مردار دیدی یا رفیق بدن (رجسٹرو) کی دس خوراکیں بھی نہ کرتیں۔ دنیا
میں یہ دوسرا منہ نہیں ہے جس کے لئے میرا ذہن یہ حد طرار ہے۔ محبت آہ محبت۔ دنیا والوں نے اس پاکیزہ لفظ کے سمجھنے میں کس قدر
فطرت کی ہے۔ یہ لوگ پسندیدگی کا نام محبت، بو الہوسی کا نام محبت، خمار گندم کا نام محبت رکھتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ فلسفہ
محبت کے بلند معیار تک ان محققوں کی کمزور نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ عشق صادق جس چیز کو کہتے ہیں انکو اسکی ہوا بھی نہیں
لگی۔ دوستی اور محبت کا فرق ان کے نزدیک بے معنی ہے۔ کوئی ان محبت کے پتلون کو کس طرح سمجھائے کہ نادانو، پہلے محبت
کے فلسفہ کو سمجھ لو پھر محبت کرو۔ میرا بدن افراط معلومات سے بھٹا جا رہا تھا۔ میں جاہر ہا تھا کہ ایک ہی سانس میں اپنی حلویت
کا تمام سیلاب بہا دوں۔ ہاں آج میں اسے بناؤ لگا کہ میں فلسفہ محبت اور اسکے ہر جزو کا کس قدر ماہر خصوصی ہوں نقیسات
کو کس طرح پانی کی طرح سہل کر کے رکھ دے سکتا ہوں۔ عشق کے رموز و نکات کا کیسا بحر و خار میرے سینہ میں موجزن ہے
ہے۔ تخلیق نفسی میں کس قدر درخور حاصل ہے۔ جی! کوئی مذاق ہے۔ شباب کی سرگزشت کو پندرہ مرتبہ پڑھ چکا ہوں“
”آہ! تیرا نظر جگر کے پار ہو گیا“ حاد نے تڑپ کر کہا

”تیرا نظر اگرچہ شاعرانہ مبالغہ۔۔۔۔۔۔ اور میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کہنا چاہئے حاد نے مجھے متاثر دیکھ کر آنکھیں
بھاڑ کر میری جانب دیکھا اور کہا ”تم تلقین دو عطا تو تہیں شروع کرو گے۔ مجھے یقین ہے!“
میں چونک پڑا انوہ! یہ بات تو میرے ذہن سے بالکل نکل ہی گئی تھی۔ میں اس کا دوست تھا اور میرا پہلا فرض تھا

کہ میں اپنے بند و نسلح سے اس اہ کی کٹھن منزوں سے اسے دور رکھنے کی کوشش کروں۔ استغفر اللہ کیا۔ بھولا تھا۔ میں نے اپنے پھرے کو سنجیدہ بنایا۔ ذرا سنبھل کر بیٹھا اور تین منٹ تک غور کرتا رہا کہ شروع کس طرح کروں۔ یکایک میں اچھل پڑا۔ پرانا مطالعہ میرے کام آیا اور میں نے حاکم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر۔ انتہائی ہمدردی کا جذبہ اپنی آنکھوں میں بیدار کر کے بڑی محبت سے کہا۔

لگائیے وگ جوانی میں کیوں میان جڑاوت ابھی تو کھیل تماشے کے تھے تمہارے دن اور پھر گویا مزید زور پیدا کرنے کے لئے آہ سرد بھر کر پرتیبہ لہجہ میں کہا ”جبکہ خدا خراب کرے وہ لگائے دل!“

حامد نے بھی ذرا..... موقع شناسی کے ساتھ بے پرواہی سے جواب دیا
یائے ننگ نہ کرنا صبح تا دان مجھے اتنا یالا کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی میراجی چاہا کہ اسکا منہ چوم لوں۔ کس قدر موقع شناس تھا۔ صرف ایک شعر سے میری ناصحانہ پوزیشن کو ختم کر کے اس دوسری منزل پر لے آیا۔ جہاں نصیحت امداد و اعانت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ”میں اب وعظ و نصیحت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی فلسفہ دانی کی شمع فروزان سے اسکو عشق صادق کے صبح ڈگر پر ڈالوں گا“ میں نے سوچا ”آہ۔ جب سے دیکھا ہے تڑپا ہوا خواب و غور حرام ہے۔ دوست وصال یار کی کوئی تدبیر؟“

وصال یار! میرے بدن میں سناٹا آگیا۔ ہمدردی کے تمام جذبات یک نخت کا نور ہو گئے۔ دل سے بجائے محبت کے حقارت کا ایک سیلاب یہ نکلا۔ ”وصال یار! در یہ مردود و خیمیت مجھے کہتا تھا کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کی کائنات محبت۔ محبت کا ادعا اور تمہارے وصال۔ ناممکن، ناممکن یہ دونوں باتیں دوش بدوش نہیں چل سکتیں محبت کا لطف تو فراق و جبر ہی میں ہے۔ ایک نفع محبت کرنے بعد دیکھنے کی آرزو ہی دل میں پیدا نہونی چاہئے یہ محبت کی توہین ہے کہ محبوب کو قطعاً فراموش کر نیکی کوشش کی جائے تاہم ایک ترک ترک کا درجہ حاصل کرے!!“

”اگر دیدار بازی کا موقع نصیب نہ تو زندگی مشکل ہے“ اس نے پھر کہا
میرے سینہ میں شعلے بھڑکنے لگے۔ میرا وہ پاکبازانہ لکچر جو میں سوچ بچتا تھا۔ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گیا۔
”اور اگر بوس و کنار کا موقع بھی ملے تو فوراً علی نور“ وہ پھر بولا۔

میں نے اپنی شعلہ فشان آنکھوں سے اسکی طرف گھور کر دیکھا۔ میں اپنی جگہ گسسا گسسا کر رہ جاتا تھا و فوراً غضب سے قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ کس قدر بیہودہ بکواس تھی۔ محبت سے کوسوں دور پاکیزگی کا میلون پتہ نہیں اف سے ملعون ہوا ہوتا۔
”دیکھیں ان کے پھول کے رخساروں کو چومنا کب نصیب ہوتا ہے“

استغفر اللہ! میرا بدن تھر تھرتھانے لگا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں ڈنڈے کے زور سے اسے صبح راہ محبت بتانے کی خواہش

اپنے دل میں پارہا تھا۔

”آہ یہ روز بھر ختم ہوا اور شب وصال اپنا روئے زیبا دکھائے“

معاذ اللہ! میں نے اپنی جیب میں چاقو کھول لیا۔ میرے سر پر خون سوار ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور کچھ بعید نہ تھا کہ وہ چمکتی ہوئی چیز جیب سے باہر بھی آجاتی۔ مگر یکایک باہر آہٹ ہوئی اور سعید، منیر، دا جدا اور ضیا داخل ہوئے۔

ہماری پارٹی مکمل تھی۔ مجھے قدرے سکون و مسرت حاصل ہوئی کہ اب مجھے داد ملیگی اور حامد کو خوب آڑے ہاتھوں لوٹکا میں نے فوراً اپنے براہِ تختہ حیات کو فرو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، قبس اس کے وہ لوگ کرسیوں پر اچھی طرح بیٹھ چکین کہنا شروع کیا ”یہ نا پاک ہستی جو اس وقت پلنگ پر دراز ہے۔۔۔۔۔“

”کیا بات ہے“ واحد نے اپنی عینک میں سے جھانکتے ہوئے میرا قطع کلام کیا
”منیر، بولا“ آپ کی گفتگو کی تمہید چونکہ نہایت نامعقول طریق پر شروع ہوئی اس لئے۔۔۔“
”واہی ہو“ میں نے کہا ”بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔“

سعید نے شرارت سے کہا ”پتلے اپنے الفاظ کو واپس لیجئے اور تحریری معافی مانگیے“

ضیا، سب سے چھوٹا مگر سب سے کھوٹا تھا، بندر کی طرح آنکھیں ملا کر بولا ”اور پھر ایسا یا در کھئے تاکہ آج کا یاد کیا برسوں نہ بھوئے!! اس نے آنکھ سے دو اون کی الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اس پر سب مسکرا دیئے۔

میں نے پٹیاں کس لین اور اپنے قد کے پانچ فٹ چھ انچ کی پوری لمبائی لئے ہوئے تن کر کھڑا ہو گیا ”عراق دلی طرح میں آپ لوگوں تک خبر پہنچانا چاہتا ہوں کہ جناب کو خود ان کے قول کے مطابق مرضِ محبت لاحق ہو گیا ہے“
حیرت کی ایک بے معنی آواز سب کے منہ سے نکلی اور سب کی آنکھیں حامد کے چہرہ پر گرا گئیں۔
”مرحبا!“ سعید نے اپنی عینک ریشمین رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا ”آفرین“

عمر رست کہ آواز دہ منصور رکن شد من از سر نو جلوہ وہم واد در سن را
منصور اور دادر در سن کا نام منکر میری باچھین کھل گئیں۔ احمد اللہ کہ سعید محبت کی منزل اعلیٰ میں یقیناً میرا ہمراہ ہو گا۔ ورنہ اگر اسکی بھی ذہنیت اس قدر رست ہوتی تو اتنا اعلیٰ شعر نہ پڑھتا۔

منیر نے ہنس کر کہا ”دور مجنون گذشت و نوبت ماست“

میسوے سینے میں و فور مسرت سے آماس پیدا ہونے لگا۔

واحد نے کہا ”عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد“

”بلاکش! عمرت وراز باد تم سب میرے ہم خیال ہو“ میں نے سوچا اور خوشی سے میری سانس پھولنے لگی۔

”منیا، نے گری کی پشت کو بنی دونوں بٹلون میں لیتے ہوئے اپنی بالک آواز میں کہا۔ ”عاشقی کھیل نہیں جسے لوگ کھینچیں
اس کعبت کے نزاع میں سے کبھی نہیں جانیگا۔“ میں نے سوچا۔ میں نے ایک عمر رسیدہ ماسٹر کی طرح تبسم کیا۔ وہ تبسم
جو صرت اس وقت نمودار ہوتا ہے جب لوگ کے سبق اچھی طرح یاد کر لیتے ہیں۔ پھر ایک لمبا مذاہنچیف کی طرح ان سب نظریات
کا نذر لیتے ہوئے کہا ”اور آپ کو یہ این ادعاے محبت تمناے وصال بھی ہے!“

سب حیرت زدہ ہو کر میری جانب ان نظروں سے دیکھنے لگے جیسے کوئی پائل کو دیکھتا ہے۔ میں بھوچکا سا ہو کر رہ گیا
مجھے کامل توقع تھی کہ میری زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی سب گھبرا کر ایک تھقہ لگا دیں گے۔ اور ابھی دم کے دم میں لعنت کے
دوٹ پاس ہو جائیں گے۔ آخر چند لمحے کی تکلیف وہ خاموشی کے بعد واحد نے چھڑی سے زمین کر دیتے ہوئے کہا ”افسوس
ہے ہم آپ کا مدعا سمجھنے سے قاصر رہے۔“

”میں نے کھیلنے پن سے کہا۔ یہ۔ یہ۔ من خوب می شناسم۔ جی ہاں مدعا سمجھنے سے قاصر رہے۔“
”نہیں واقعی“ میر نے تاکید کی۔

”تم لوگ فضول باتیں مت کرو۔“ میں نے کہا اور خفت چھپانے کے لئے پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔
سعید نے کہا ”جناب محترم نے جو اپنی زبان فیض ترجمان سے یہ فقرہ اس تیور کے ساتھ ادا فرمایا جیسے کوئی استعمار
عقلی یا عادی کا تذکرہ۔۔۔“

میں نے جھنجھلا کر کہا ”خاموش رہو۔ میں ان بڑے بڑے لفظوں سے مرعوب ہونے والا نہیں ہوں ابھی کلام مجید
سننے رکھ کر گفتگو شروع کر دی تو ساری لغت والی دہری رہ جائیگی۔“

سعید نے پھر کہا ”آخر جناب کس استدلال کی بنا پر محبت سے تمناے وصال کو منطک کر سکتے ہیں“
میں نے کہا ”اللہ تم سب لوگ کو کھے ہو۔ محبت کی تعریف سے اصلاً واقف نہیں۔“

سعید نے اپنے چہرہ پر شاگردانہ جھلک پیدا کر کے کہا ”تو ہمیں کامل امید ہے کہ جناب ہمارے تاریک دماغوں کو
اس خاص روشنی سے منور فرمائیں گے۔“ اسکی اس سنجیدگی پر مجھے غصہ آنے لگا۔ کم نخت ہزار مرتبہ اس موضوع پر میرے خیالات
سن چکے تھے مگر کیسے انجان بن رہے تھے

”منیا،“ مگر پہلے تمناے وصال کی تشریح تو ہو جانا چاہئے وصال کی کون سی صورت؟“
سعید ”ہر ممکن صورت۔ ذرائع کو اتنی اہمیت نہ دینی چاہئے۔“

میرا خون کھولنے لگا۔ میں اپنی پہلی غیر متوقع شکست کی وجہ سے دفعتاً کچھ تھک گیا تھا۔ لیکن یہ الفاظ سن کر میری
طاقت عود کر آئی افوہ! یہ مردود اپنی بوالہوسی اور بد معاشی میں یہاں تک ترقی کر گئے ہیں۔ بڑے فلسفی بنے ہیں اور محبت
کے متعلق اس قدر رکیک خیالات رکھتے ہیں میں نے پھر کر کہا ”مالا فقور تم میں حیوانی روح حلوں کر گئی ہے۔ تم لوگ شیطان کی

”چپ رہو“ مین نے غصہ سے کہا۔

ضیاء: ”اچھا تو مطلوب طالب کے قدموں پر سہی، یہ نہیں تو محبت کے مایوس مریضو! پھر نہاب کی سرگذشت ہے!“
 ”بالکل خاموش ہو جاؤ“ مین نے دانت کٹکٹا کر کہا
 ”اے آپکو خدا کی قسم مجھے شروع سے آخر تک بڑھوئے متعلق کیا خیال ہے
 واحد نے بطور تجویز کے کہا۔

عنان ضبط میرے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھی۔

مین: ”نہیں بھئی اللہ شوق دے تو کتا مین بڑھا کرو“ قہقہہ پڑا۔

سعید نے سنجیدگی سے کہا یہ سب کچھ نہیں اسکا صرف ایک علاج ہے ”سب ہمہ تن اشتیاق ہو کر سکی طرف دیکھ لگے
 کہ بخت نے کچھ ایسی سنجیدگی سے کہا کہ خود میرے دل مین بھی شوق پیدا ہوا کہ دیکھیں کیا کہتا ہے
 ”اسکا علاج“ اسنے کہا ”بہترین علاج صرف ایک ہے اور وہ اسنے گلاصاف کیا، یہ کہ پندرہ دن مین بال جڑ
 سے کالایا۔“

اسپر ایک فلک شگاف قہقہہ پڑا۔ مین اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ غصہ سے میرا بدن کانپ رہا تھا۔ ”بکومت“ مین نے
 چیخ کر کہا ”بکومت“ مین گرج اٹھا ”بکومت“ مین نے دیو کی طرح چنگھاڑ کر کہا دفعۃً باہر زینہ پر کسی کے جلد جلد اترنے
 کی آواز آئی اور دوسرے لمحہ والد بزرگوار حیران و ششدر کر کے مین داخل ہوئے سب کھڑے ہو گئے۔ یہ آہستہ آہستہ
 کرسی پر اکر بیٹھ گئے اور اوہرا دھردیکھ کر بوجھا ”یہ کون جنگلیوں کی طرح چیخ رہا تھا؟“ سب کی نظر مین پر پڑی
 اٹھ گئیں۔

”یہ راشد ہو گا۔ مین پہلے ہی سمجھا تھا اور اس خبطی کے سوائے کون ہو سکتا ہے“ ان کے چہرہ پر تبسم کے آثار نمایاں ہوئے
 اور میرے دوستوں کی طرف مخاطب ہو کر انھوں نے بوجھا کیا بات تھی۔ محبت کے متعلق گفتگو تھی یا اشتہاری دواؤں کے
 سب کے سب نظر مین چھکا کر مسکرانے لگے۔ میرے بدن مین سنسنی پھیل گئی۔ مین نے اپنے دوستوں کی نظر مین جو وقعت
 پیدا کر رکھی تھی وہ آج والد بزرگوار فنا کئے دے رہے تھے۔

”خدا جانے اسے کیا خط ہو گیا ہے“ وہ پھر یوں ”گھر مین بھی ہر وقت اسی قسم کی باتوں پر مباحثہ کرتا رہتا ہے۔ اس کے
 چھینٹنے پر اور سب اسے چھیڑتے ہیں“ پھر میری طرف دیکھ کر کہا ”شرم نہیں آتی۔ بی۔ اے تک کی پڑھائی۔ کاندھو کے اے
 مین بہائی۔ تمہیں اشتہاری دواؤں سے فرصت ملے تو کوئی اور کام کرو۔“

سعید۔ جناب قبلہ ہمارا بھی انھوں نے ناک مین دم کر رکھا ہے۔ اسی لئے ہم آج ارادہ کر کے آئے تھے کہ آج انھیں
 خوب بنائیں گے اور انکی یہ عادت ہمیشہ کے لئے چھڑا کر بیٹھے۔ ہم نے حامد کو پہلے ہی پٹی بڑھا کر بھیجا دیا تھا۔ وہ تو آپ تشریف

لے آئے ورنہ ہم آج ان سے عہد لیکر چھوڑتے۔“

”جھوٹا نامراد۔ ارادہ کر کے آئے تھے۔ سب جھوٹ حامد یقیناً عاشق ہو کر آیا تھا، سعید نے اس ڈر سے کہ کہیں والد نے سب کچھ نہ سنا ہو اور حامد کے باپ سے کہدین یہ اور مجھے بنانا! والد نہوتے تو بتاتا کہ تم مجھے کس طرح بناتے ہو۔“

”ا! ناشدنی۔ سب ہی تو تجھ سے تنگ ہیں۔ پھر کہنے لگے ”عزیزم سلمہ! ہم تو تمہارے بچلے کے لئے کہتے ہیں۔ آگے تم جانو۔ دودھی خوار ہو گئے۔“

سلمہ۔ ہونہ۔ مارتو ڈالا اور سلمہ۔ تمام دوستوں کے سامنے ذلیل کیا۔ سخت تحقیر ہوئی۔ منہ دکھاتے شرم آئیگی۔ سلمہ۔ ہونہ۔ غرض قصہ مختصر یہ کہ اس دن والد نے بڑھتی کی۔ مین بیوقوف تھا۔ جو ان عاقلانہ مسائل کا تذکرہ ان نادانوں سے کیا کرتا تھا۔ اس دن کے بعد سے مین نے مطلقاً ان لوگوں کے سامنے ان عین مسائل کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ نادان ہیں۔ کم فہم ہیں۔ نہ یہ محبت کو جانیں نہ جینتان کو۔“

یہ ہے وہ قصہ جو موسم گریا کی ایک گرم دوپہر میں راشد نے مجھے سنایا۔ اپنے حلقہ تعارف میں وہ مخبوط الحواس مشہور ہے بعض جنون اور مایخو لیا کامرض بتاتے ہیں۔ مین نے ذاتی طور پر اس کے متعلق کبھی کچھ نہیں سوچا۔ لیکن اگر چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ اسکی دماغی حالت اس نقطہ پر ہے جہاں دیوانگی اور فرزانگی کے ڈانڈے ملتے ہیں پھر کیا اسکی دیوانگی کوئی عجیب یا کیا ب دیوانگی ہے۔ اثنائیں کہتے ہیں جو اصلیت کے ادراک میں کچھ نہ کچھ اس طرح نہیں بھک جاتے؟ کہتے ہیں جو حقیقت کا پتہ لگا سکتے ہیں؟ ہم کم و بیش راشد ہی کی طرح چند در چند گمراہیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم مین سازداری اور ضبط کی قوت اس سے زیادہ ہے۔ فرسٹ ایڈ کو اس کے لئے میٹر یا میڈلکا کی قائم مقام ہو۔ لیکن غالباً وہ محبت اور جینتان کو ہم مین سے اکثر سے بہتر جانتا ہے!

رفیعی اجمیری

مستریاق حشیم

اس کے متعلق حضرت نیاز فتح پوری صاحب اٹیڈ رسالہ نگار تحریر فرماتے ہیں کہ تجربہ سے یہ سمر بہت مفید ثابت ہوا ہوا اور اس کے بہت سے امراض کیلئے کارآمد چیز ہو۔ قیمت علاوہ محصول (۱۰ روپے)

انڈین میڈیکل سٹور نظر آباد لکھنؤ

مومن و کلام مومن

(یہ سلسلہ ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء)

خصوصیات غزل | لغت میں غزل کے معنی ہیں ”حدیث زنا“، ان کے ساتھ عشق بازی کرنا اور اسے عشق بازی کرنا خطرے کی پروا نہ کرنا

صاحبِ معجم کی رائے ہے کہ ”غزل کو مناسب اور خوشگوار وزن شیریں اور سلیس الفاظ، دلنشین معانی سے آراستہ ہونا چاہئے، درشت کلمات اور ناگوار ترکیب سے بچنا غزل گو کا اولین فرض ہے

سعدی اور حافظ، جامی اور خسرو غزل کہنے والوں کے سرمجامع اسی لئے ہیں کہ ان لوگوں نے غزل کی زبان الگ کر لی ہے۔ اردو میں غزل گوئی کے میدان میں میر سب سے آگے اس وجہ سے ہیں کہ غزل کے لئے انھوں نے الگ اقلیم بنا لیا ہے لیکن اس کے ساتھ ”میر“ جذباتِ تغزل“ کے نشہ میں اس قدر متوالتے ہیں کہ ان کو ”الفاظ“ اور دوسرے آواز کے اہتمام کی طرف جہل توجہ نہیں ہوتی، مومن نے جذبات کے ساتھ قیود اور پابندی کے آدر و میں آواز کا رنگ پیدا کر کے دنیا کے سامنے ایک نئی چیز پیش کی ہے۔

معنوی حیثیت سے دیکھئے کہ غزل کی بنیاد حسن و عشق ہے، حسن عشق پیدا کرتا ہے، عشق سے حسرتِ دل اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ عشق، عاشق کو دلیر اور جانناز بنا دیتا ہے، اس کو جانناز کی چیز کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔ فارس کا ایک شاعر کہتا ہے: ”عشق، تاسمہ ندیم پانہ کشم از سر کوشش نامردی و مردی قدے فاصلہ دارد“ ”مومن“ اس مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے:۔۔۔

کشتہ ناز جان روز ازل سے ہوں مجھے جان کھونے کے لئے اللہ نے پیدا کیا

۲۔ عشق میں معشوق پرستی کے علاوہ عاشق کا کوئی مشغلہ نہیں ہوتا، عشق ہی عاشق کا اپان ہے عشق ہی عاشق کا غریب ہے۔ فارس کا شاعر اس مضمون کو یوں ظاہر کرتا ہے:۔۔۔

دو عالم را بہ یک بار از دل تنگ بردن کردیم تا جائے تو باشد

”مومن“ نے اس مضمون کو ایسے آواز کے انداز میں بیان کیا ہے کہ شعر موتی بن گیا ہے:۔۔۔

چارہ گر حجت میں اس کے آستانے لیئے ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پہ کیا

”جنت“ راحت و آرام کی عبادت اس کا حصول طلب خدا کا ثمرہ ہے، ”مومن“ اپنے عشق میں یک در گھر

و محکم گیر، کو کس طرح ثابت کرتے ہوئے آستان یار کو جنت پر ترجیح دیتے ہیں۔
 سلم۔ عاشق، عشق کی مصیبتوں سے چھوٹنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ان کو عشق کا شعار جانتا ہے۔ فارسی شاعر کہتا ہے
 ناله از بہر رہائی نکلند مرغ اسیر خور و افسوس زمانے کے گرفتار بنود
 ”مومن“ اس مضمون کو اس طرز میں ادا کرتے ہیں:

اب قید سے امید رہائی نہیں رہی ہمدرد پاسیان ہیں جو زندانیوں میں ہم
 علم موازنہ اور مقابلہ کے بعد ”مومن“ کو جذبات تغزل میں ”حافظ“ کے سامنے لا کر دیکھئے، حافظ کا پایہ تغزل میں
 ایسا ہے کہ اُستادان فن حافظ کی غزل گوئی کو کرامات کہتے ہیں۔

موازنہ حافظ و مومن | (حافظ) جان ز ابرو سے عید از ہلال و سہم کشید
 ہلالی عید برابر و سہم یار باید دید

(مومن) نیم سہل ہیں نہ چھیڑے تبش دل کہ ابھی روئے قاتل کا نظارہ کوئی دم کرتے ہیں
 حافظ صاحب کہتے ہیں کہ ہلال عید کے جو لوگ منتظر ہیں ان کو ابرو سے دوست دیکھنا چاہیے وہی سب کچھ ہے۔
 ”مومن“ ایسے عاشق بیتاب و از خود رفتہ کو عید اور محرم کی کیا خبر وہ نظارہ یار کے وقت بخودی سے دل کا اضطراب
 بھی پسند نہیں کرتا کیسا داس کیسوئی نظارہ میں فرق آ جائے۔

انصاف شرط ہے دیکھئے دو نون شاعر و نون میں جذبات عشق و محبت کس نے بہتر صورت میں ادا کئے ہیں
 (حافظ) دانی کہ چہیست دولت دیدار یار دیدن در کوئے او گدائی بر خسر و خریدن
 (مومن) گلی میں اس کے نہ پھر آتے ہم تو کیا کرتے طبیعت اپنی نہ جنت کے درمیان لگی
 حافظ کہتے ہیں کہ معشوق کے کوچے کی گدائی بادشاہی سے بہتر ہے

”مومن“ کا عشق جنت بر کوئے یار کو اس طرح ترجیح دیتا ہے کہ مجال دم زون باقی نہیں رہی
 (حافظ) شراب لعل کش و روئے سہم جینان بین خلاف مذہب آنان جمال اینان بین
 (مومن) مے نہ اتر می گلے سے جو اس بن مجھ کو یار و ن نے پارسا جانا
 ”حافظ“ صاحب شراب پینے اور نظارہ یار کرنے کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام پسند نہیں کرتے

”مومن“ کے حلق کے نیچے شراب زہر کی طرح بھی ہجر میں اتر نہیں سکتی

”حافظ“ کے یہاں بیشتر خوشحالی اور زندانہ فانیغ البانی صورت دکھاتی ہے۔

”مومن“ عاشق تین کے یہاں اس کا ذکر کمان جذبات تغزل و عشق میں دو نون کا فرق ظاہر ہے

”حافظ“ سے موازنہ کا منشا یہ تھا کہ ”مومن“ نے جذبات تغزل کا جو مفہوم سمجھا ہے وہ جذبات عشق کے عین بقا ہے

عاشق کو جیسا ہوتا چاہئے، مومن اپنے اشعار غزل میں نمایاں ہے۔
 ناقدان فن اور صاحبان مذاق نے غزل یا عشق کے جذبات کو ذیل کی صورتوں میں نمایاں کیا ہے۔
 (مشتوق کا انداز کج ادائی)

جذبات تغزل

فارسی شاعر کہتا ہے:

باغیر نشینی و فرستی ز پئے ما آن را کہ نداء رو کا شائد مارا

”مومن“ کی شان دیکھیے:

مجلس میں تاند دیکھ سکون یار کی طرف دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف
 فارسی شعر میں مشتوق اپنے محفل میں بلانے اور غیر کے ساتھ ملاطفت دکھانے اور عاشق کے جلانے کے لئے اس کو ایسے
 شخص کی معرفت بلواتا ہے جو عاشق کا گھر تک نہیں جاتا۔
 ”مومن“ کا رنگ دیکھیے کہ وہ مجلس میں موجود ہے، رقیب کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھتا ہے، اس پر اکتفا نہیں بلکہ عاشق
 کے جلانے کو مشتوق عجیب لطیف انداز کج ادائی دکھاتا ہے۔

ارباب فن دونوں کا فرق محسوس کریں اور ”مومن“ کے جذبات کی داد دیں،

مشتوق کا ذکر کسی عنوان سے ہو بہتر ہے)

فارسی شاعر کا خیال دیکھیے:

بہر مجلس کہ جا سازم حدیث نیکو ان پریم کہ حرف آن مہ نامہربان را در میان پریم

”مومن“ کا انداز دیکھیے:

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا مین تو کیلکنا کہ ہر سہ بات پر ناصح تمہارا نام لیتا تھا
 پہلے شعر میں ذکر مشتوق معمولی رنگ میں ہے، خود عاشق ذکر کرتا ہے اگرچہ اس کے لئے پیرایہ تلاش کرتا ہے۔
 ”مومن“ نے دشمن عقل ”ناصر“ کی نصیحت میں عشق کے مزے لئے ہیں، اس مضمون کو مومن نے کہاں سے کہاں پچاؤ

عربی کا ایک شعر بالکل اسی مضمون کا ہے:

احب العدا و لکنک اسلا حدیث الحبيب علی مسمعی

نصیحت کرنے والے کی نصیحت اس لئے پسند کرتا ہوں کہ بار بار دوست کا نام سننے میں آتا ہے

”مومن“ کی بلند خیالی نے اور لطیف انداز بیان نے دونوں شاعر دن کو پست کر دیا

(ستم محبوب)

فارسی شعر ہے: ابن جوہر دیگر ست کہ آزار عاشقان چندان نمی کند کہ بہ بیدار خو کند

مومن :۔

جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو یوفا پھر حاصل پیدا کیا
مضمون قریب قریب دونوں ایک ہیں مگر ”مومن“ نے اپنے شعر میں اثر کی بجلی بھر دی ہے، الفاظ اور بندش سے
آسمان شاعری میں تارے جڑ دے ہیں
(محبوب کی نسبت بدگمانی)

فارسی شاعر کہتا ہے :۔

کاش اے محرم نمی پر سیدیم کان مہ کجاست یک سخن گفتی و بازار اندک گانم سوختی

مومن :۔

روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دیگا ان کو شوقِ آرائشِ دل ہے بدگمانِ پنا
(معشوق کو خط لکھنا)

فارسی شاعر کہتا ہے :۔

بہ جانان نامہ ہرگز عاشق بیار نہ نویسید کہ از بے طاقتی یک حرف راصد بار نویسید

مومن :۔

حالی دل یار کو لکھوں کیونکر ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

(کستم کی ادا)

فارسی شاعر کہتا ہے :۔

تا مرا در نظر مدعیان خوار کند ہر چہ گویم بخلافِ سخنم کار کند

مومن :۔

لاش کس کی ہے؟ یہ عدو سے نہ پوچھ مین ہوں گشتہ ترے تغافل کا

فارسی شعر میں ابتداء ادا ہے اور مومن کے شعر میں انتہاء، لطف بیان نے شعر کو اپنا کر لیا ہے۔

تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو ضخیم دفتر ہو جائے، بیان یہ دکھانا منظور ہے کہ ”مومن“ نے تغزل کا جو مفہوم
سمجھا ہے اور دوسروں کو سمجھانا چاہا ہے وہ اپنی جگہ بری نہیں ہے، مومن سے پہلے فارسی شاعری اردو کے سامنے جو کچھ
ناز کرتی بجاتھا لیکن ”مومن“ نے اپنے کمال شاعری سے اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی کو اس مرتبہ پر پہنچا دیا
ہے کہ اس کا جواب مشکل سے کسی زبان میں مل سکتا ہے

”مومن“ کا یہ کمال دیکھئے کہ غزل، مثنوی، قصیدہ، واسوخت کی زبان، ترتیب و الفاظ، معانی۔

انداز بیان - لہجہ وغیرہ میں نمایان فرق رکھتا ہے۔

الفاظ غزل | غزلوں میں مومن نے جس طرح الفاظ کا اہتمام کیا ہے اس کی چند مثالیں دیکھ لیجئے:-

یہ جوش یا اس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت دعاۓ وصل نہ کی وقت تھا اثر کا ”سا“
اس شعر میں لفظ ”سا“ جس اہتمام سے رکھا گیا ہے اس نے لطیف معانی کو دو بالا کر دیا ہے۔

یہی ”سا“ تمام غزل میں علیحدہ علیحدہ رنگ دکھاتا ہے۔ دوسری غزل میں دیکھئے:-

اس کو بچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا بھس گیا
ایسی لذت خلش دل میں کمان ہوئی ہے رہ گیا سینہ میں اس کا کوئی پیکان ہوگا

اس شعر میں لفظ ”کوئی“ کی تنکیہ نے ایسی خوبی اور دلکشی پیدا کر دی ہے جس نے تمام شعر بالخصوص پہلے مصرعہ کو ساپنے میں ڈال دیا ہے۔

درد ہے جان کے عوض ہر رگ پے پین ساری چارہ گر! ہم نہیں ہونے کے جو در مان ہوگا
اس شعر میں ”نہیں ہونے کے“ الفاظ نے محاورہ کی بسیا سنگلی کے ساتھ اظہار جذبات میں جادو کیا ہے۔

سینے سے گھبرا کے آخر جان لب تک گئی حال پہونچا یاں تلک اور تم نہ کئے یاں تلک
اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں یاں تلک دو جگہ کس طرح آیا ہے اور دونوں جگہ کیا کام کر رہا ہے اسباب فن سے پوشیدہ نہیں
کیا دل کو لے گیا کوئی بیگا نہ آستنا کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم
اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ”سے“ کتنا فصیح ہے؟

اے خوڑ گئی ہے بیطرِ زانوے جانا کی یہ سر تنیکہ چہ ہم جس طرح رکھوں نہ ٹھیکہ رنگ
اس شعر کے دونوں لفظ ”بیطرِ اور“ نہ ٹھیکے گا“ کا انداز دیکھئے

معانی غزل | جس طرح غزل میں ”الفاظ“ درد و بیتابی، یکسی، جذبات کے اظہار کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اسی طرح ”معانی“ کا حال ہے، ”مومن“ نے اپنی غزلوں میں اس کا بھی اسی اعتبار سے اہتمام و لحاظ کیا ہے، مثالوں سے ظاہر ہے

کیا سنا تے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل تم سے میر حرم پہ مرنے سے تو آسان ہوگا
معنوی اعتبار سے یہ شعر کتنا بلند ہو گیا ہے؟

جذبہ دل کو نہ جھاتی سے لگاؤں کیونکر آپ وہ میہ گلے دوڑ کے اکبار کا رنگ
کیوں لگے دینے خط آزادی کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

پہلے شعر میں جھاتی سے لگانے کے محاورہ میں معنوی خوبیوں کو دیکھئے دوسرے میں پہلے مصرعہ کی رعایت سے غلام

اور صاحب کے الفاظ نے معنوی حیثیت سے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے
اس قسم کے اشعار سے تمام دیوان بھرا پڑا ہے۔

لہجہ | غزل میں ”لہجہ“ کو بھی خاص وقعت اور خاص قوت ہے، مومن کو اس کے ادا کرنے پر بھی غیر معمولی قدرت ہے۔
مثال ملاحظہ فرمائیے۔

د م آخر بھی تم نہیں آئے بندگی اب کہ میں چلا صاحب
جذبہ دل نے غیر کے بھی کیا کہیں تاثیر کی آج کیوں آتے ہوئے نہ کام پر گئے ہیں آپ
مومن خدا کے واسطے ایسا مکان نہ چھوڑ دوزخ میں ڈال خلد کو کوئے بتان چھوڑ
لہجہ کی خوبی کے ہی معنی ہیں کہ مطلب کو اس طرح ادا کرے کہ اس میں تاثیر پیدا ہو جائے، ان اشعار میں یہ خصوصیت موجود ہے
لہجہ کے اعتبار سے الفاظ ”اور معانی میں جو اہتمام ہوتا ہے وہ ”مومن“ کی غزلوں میں بدرجہ اتم موجود ہے
کمال غزل یا کمال شاعری کا انداز ترکیب اور ترتیب سے بھی ہوتا ہے مثلاً:-
ترکیب و ترتیب | اے جذبہ دل وہ شوخ سگر تو اکل طرف پیغام لے کے بھی کوئی آیا نہیں ہنوز
ہم تاسحر آپ میں نہیں تھے کیا جانے رہے وہ کس کے گھر رات
جو نقاب ٹھی میری آنکھوں پر دپڑ گیا کچھ نہ سوچا عالم اس پردہ نشین کا دیکھ کر
اثر غم ذرا بستا دینا وہ بہت بوجھتے ہیں کیا ہے عشق
ہم نے تفصیل کے لئے عنوان قائم کر کے علیحدہ علیحدہ طور پر مثالیں پیش کی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ”مومن“ کے ہر شعر میں یہ تمام خوبیاں یکجا طور پر موجود ہیں۔

سلاست زبان

ہم مین اور نزع شب ہجر مین جان ہونے تک
صبر آتا ہے کوئی تاب و توان ہونے تک
مجھ پہ عاشق نہیں ہے کچھ ظالم صبر آخر کرے وفا کب تک
لے شب وصل غیر بھی کاٹی تو مجھے آزمائے گا کب تک
یا اسی مجھ کو کس پردہ نشین کا غم لگا سینے میں اندر ہی اندر کچھ کھلا جاتا دل
سرمد میں اس چشم جادو فن میں ہم خاک ڈالیں دیدہ دشمن میں ہم
اعجاز سلاست نے ظلم کے لئے مومن کی حسب ذیل غزلیں قابل ملاحظہ ہیں:-
اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا رنج راحت فرما نہیں ہوتا
مجھے جنت میں وہ صنم نہ ملا حشر اور ایک بار ہونا تھا

آسمان راہ پر نہیں آتا دعویٰ خضر بے دلیل ہوا
اسکے اٹھتے ہی ہم جانے اٹھے کیا قیامت تھا دل کا آجانا
اسی طرح ہر ردیف میں وہ غزلین موجود ہیں جن پر شاعری اور زبان فخر کرتی ہیں۔

مطلع غزل میں مطلع اور مقطع شاعری اور جذبات کی ابتدا اور انتہا میں مشکل سے کوئی شاعر ایسا ملتا ہے جس کے مطلع اور مقطع دونوں بہتر ہوں۔

”مومن“ میں یہ کمال موجود ہے۔ چند مطلع قابل ذکر ہیں

آخر امید ہی سے چارہ حرام ہوگا مرگ کی آس پہ جینا شب بھران ہوگا
دیدہ حیران نے تماشا کیا دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
میں نے تمکو دل دیا تنے مجھے رسوا کیا میں نے تے کیا کیا اور تنے مجھے کیا کیا
اتفاق ستم ناکب تک اتفاق ستم ناکب تک
شام سے تاصبح مضطرب صبح سے تا شام ہم ایک عالم میں ہیں کون اے رُروش ایام ہم
دل آگ ہے اور لگاؤ میں گے ہم کیا جانے کسے جذبات گے ہم

مقطع یہ بیجا مشہور نہیں کہ مقطع ”مومن“ کا حصہ ہے چند مثال اسکی بھی دیکھ لیجئے۔

اے تب ہجر دیکھ مومن ہیں ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں
بتخانہ میں ہو کر ترا گھر مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم
نکل کے دہرے مسجد میں جا رہے توں خدا کا گھر تو ہے تیرے اگر مکان نہیں
عمر ساری تو کٹی عشق بتان میں مومن آخری وقت میں کیا خاک سلمان ہو گئے
بتخانے سے نہ کہے کو تکلیف دے مجھے مومن بس اب معاف کیان جی اہل گیا
دوستی اس صنم آفت ایمان سے کرے مومن ایسا بھی کوئی دشمن ایمان ہوگا

”مومن“ نے غزل کے ہر صنف میں اشعار کہے ہیں، ان کے اشعار عاشقانہ بھی ہیں رندانہ بھی، ظرافت بھی جھلکتی ہے، شراب کی مستی بھی لیکن کسی صنف کو اپنے خاص رنگ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

واعظ اور ناصح کو بڑے بڑے متین اور مہذب شعرا نے بے نقط سنائی ہیں اور اس میں وہ تہذیب اور سادگی کی حد سے گزر گئے ہیں، میرا ایسے خود دار وغیرہ متین و مہذب شاعر نے بھی اس رنگ میں یہ کہہ دیا ہے۔

مین داڑھی ترمی عظمیٰ مسجد ہی مین منڈوانا
 پر کیا کروں ساتھ اپنے حجام نہیں کھتا
 مومن کو اس رنگ مین دیکھئے:۔
 اس وسعت کلام سے جی تنگ آ گیا
 ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا
 کیا پوچھتا ہے تلخی الفت مین پندگو
 ایسی تو لذت مین ہیں کہ تو جان کھا گیا
 حوروں کی شناختی و عطر یونی کبانی
 لے آکھے نادانی باتوں مین بل جانا
 ”مومن“ نے جہان کینن خمریات “ مین مستانہ مضمون لکھے ہیں وہاں بھی حدود شرعی سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔
 استاد مولانا آسی رح سکندر پوری فرمایا کرتے تھے کہ ”شعرا ایسا ہونا چاہئے کہ برسرِ منبر بڑا جاسکے“
 یہ تعریف ”مومن“ کے کلام (غزل) پر صادق آتی ہے۔

باقی — باقی

کیفی چریا کوٹی

عطر

نیل

عطر

ہر ماہ مین دس روپیہ کا عطر بطور تحفہ

اگر آپ کو ایسے عطرون کی خواہش ہے جو آپ کے دماغ کو تروتازہ کر دیں۔ اور جن کے لگانے سے آپ کو یہ معلوم ہو کہ آپ
 چھوٹکی کیا رہیں جیسے مین تو ہمارے نئے طریق سے تیار کردہ عطرون کا استعمال کریں جو میسور گورنمنٹ کے کارخانہ کے خاص صندل کے
 نیل مین تیار کئے جاتے ہیں گوہمہ پاس ہر قسم کے قیمتی سے قیمتی عطر موجود ہیں لیکن مندرجہ ذیل سے عطر دیکھ کر ٹوٹے ہوئے ہمارے ہم سفارش کرتے ہیں
 عطر جنیبل عطر گلاب عطر سوسن عطر عباسی عطر نریری عطر سنگترہ عطر کرنا عطر زکس عطر خس ہر ایک عطر فی تولد انکے علاوہ جنیبل عطر گلاب سوسن تبریزی
 سنگترہ اور زکس کے عطریں بھی تیار ہیں۔ ہر ماہ مین رقمہ ڈال کر اپنے گاہکوں سے ہمیں پتہ مین نمبر دین پر
 رہنے والوں کو پانچ روپے مین روپے دھند روپے کے عطر بطور تحفہ بھی کرینگے۔ اگر آپ اپریل کے انام مین حصہ لینا چاہتے ہیں۔ تو فوراً اپنی درخواستیں
 ہمارا دلکش ایئر ٹیل۔ بادام روغن۔ زیتون اور نمونہ کیتل سے مرکب مفید ادویہ سے تیار کردہ خوشبو دار تیل فی سیر عہ اور پڑھ کر کی بوتل
 عطر کی باتوں کیلئے بہترین تیل ہے۔ فوراً منگو کر دیکھیں۔ درخواست دیتے وقت یہ بات یاد رکھیں۔

دلکش پرفیوری کمپنی۔ قادیان ضلع گورداسپور (پنجاب)

انتظار

(افسانہ)

یہ افسانہ ماس ہارڈی "انگلستان کے مشہور ناول نگار کے ایک افسانہ کا چرچہ ہے۔ اس افسانہ میں مین نے بہت کچھ تعریف کی ہے۔ تاہم افسانہ نگار کا جو مقصد تھا وہ اپنے حال پر قائم رکھا گیا ہے۔

(۱)

انتظار نام ہے تناؤں کی دنیا کا، انتظار کا ختم ہونا اس دنیا کا فنا ہو جانا ہے، کائنات انتظار میں وہ تمام رنگین بستیوں میں جاتی ہیں اور ان تمام سڑکوں کی روشنیوں جگمگانے لگتی ہیں جن سے قلب انسانی کو بہت گہرا ربط ہے۔ اس دنیا میں کسی کی آمد۔ کسی کی ملاقات، کسی کا میاں، کسی مراد اور کسی لطف کا انتظار نشوونما پاتا رہتا ہے۔ وہ نشوونما پاتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی عمر کا وہ آخری اور طربناک لمحہ آپہنچتا ہے جب منتظر کو سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر مطلوبہ شے کو پالنے کے بعد انتظار کی سرزمین ختم ہو جاتی ہیں

غرض منتظر، اپنی آرزو اور خواہش سے واصل ہونیکے بعد بالکل دیسا ہی بن جاتا ہے جیسے کسی ہرے بھرے درخت سے پھول پھل ٹوٹ جائیں، جیسے کسی خوبصورت طائر کے پر نوچ لئے جائیں یا جیسے کوئی تھیر کا ایکڑ اپنی تمام آرائشوں سے محروم کر دیا جائے۔

(۲)

صابرہ کی غمگین زندگی گویا انتظارِ مجسم تھی۔ وہ حسین تھی، لیکن نہ اتنی حسین کہ حور کا دھوکہ ہو، شاید اب سے کچھ عرصہ قبل وہ ایسی ہی رہی ہو لیکن اب اس میں نہ کوئی ساحریت تھی اور نہ کوئی خصوصیت کیونکہ اسکی زندگی، ناکامیوں اور مایوسیوں کا گہوارہ بن چکی تھی، وہ ایک کمزور اور نازک بدن عورت تھی، اور اس کی عمر بیس برس کی تھی، اس کے اعضا بہت مناسب اور موزون تھے لیکن اب ان میں انخطاط نمودار ہو چلا تھا۔ اس کے رخسار جو کسی وقت گلاب کی طرح چمکتے تھے اب ان پر زردی چھا گئی تھی۔

صابرہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی، اور قسمت سے اسکی شادی بھی ایک غریب ہی خاندان میں ہوئی تھی لیکن شادی کے بعد یہ ضرور تھا کہ دونوں میان بیوی انتہائی الفت و محبت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

مگر انقلاباتِ زمانہ اور گردشِ ایام نے انھیں اس غریبی میں بھی سکون سے ایک ساتھ بیٹھے نہ دیا۔ اور وہ وقت بہت جلد آپہنچا کہ میان بیوی ایک دوسرے سے ایک نامعلوم زمانہ کے لئے جدا ہو جائیں

(۳)

”صابرہ، خدا کو ہی منظور تھا۔ اس کا غم نکلے۔ اگر میں زندہ رہا تو بہت جلد واپس آدنگا۔“ شاہد نے صابرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا جب وہ ایک گوشہ میں بیٹھی ہوئی اپنے تاریک مستقبل پر غور کر رہی تھی صابرہ تھیں کیا خبر کہ تمہارے بعد میری کیا حالت ہوگی۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔“ اس کی سرنگین اور پُر نور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

شاہد:- تمہیں رونا نہ چاہئے۔ صابرہ تھیں صبر و استقلال سے کام لینا چاہئے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ جنگ سے وہیں آنی کی امید باقی نہیں رہتی؟

شاہد:- ہاں میں تو یہی سمجھتی ہوں شاہد۔ گری میری زندگی وہاں ہو جائیگی۔

شاہد:- صابرہ تھیں اس قدر جلد یا دوس نہونا چاہئے۔ کیا تم خدا کو بھول گئی ہو؟ کیا ہماری آئندہ ملاقات کو محض ایک وہم تصور کرتی ہو۔ صابرہ اگر تمہارا یہی حال رہا تو مجھے کہیں بھی چین نہیں مل سکتا۔ اور میں کچھ نہ کر سکتا صبر سے کام لو۔ اور خدا پر بھروسہ کرو۔ اس کی قدرت سے تو یہ بات بعید نہیں ہے۔ صابرہ:- مگر آہ میرا دل تو بے قابو ہوا جاتا ہے شاہد مجھے ضبط نہیں ہو سکتا۔

وہ رونے لگی شاہد نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اس طرح دونوں میان بیوی بہت دیر تک بیٹھے رہے:

(۴)

آفتاب کی شعاعیں صابرہ کے حرمان نصیب کا شانہ پر سیاہ بادلوں کی طرح چھائی ہوئی تھیں۔ وہ گھر سے ملے ہوئے ایک ویران چمن کے ایک ویران کونہ میں بیٹھی ہوئی اپنی بد نصیبی پر ماتم کر رہی تھی۔ اور کیوں نہ کرتی جب دنیا میں خدا کے سوا اسکا اور کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ جدائی اسے اس قدر شاق گذری کہ کئی دن تک کھانا پینا حرام ہو گیا۔ اس جدائی نے گویا اس کے تمام جسم کی روح نکال لی تھی اور صرف دماغ میں اس کا اثر باقی رہ گیا تھا وہ ابے نیا میں تنہا تھی۔ تنہا اور بالکل اکیلی۔ اس کی ساس اور خسر عرصہ ہوا کہ مریچکے تھے۔ صرف صابرہ کی مان زندہ تھی۔ شادی کے کچھ دنوں کے بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ مان کی جدائی نے صابرہ کو بہت تکلیف پہنچائی اور ابھی وہ غم دل سے بھولانہ تھا کہ شوہر کی جدائی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب اس صدمہ کو برداشت کر نیکی طاقت اس میں بالکل نہ رہ گئی تھی ہوقت اس کی حالت بالکل اس جہان کی طرح تھی جو طوفان میں ہچکولے رہا ہوا جس کے بچنے کا یقین بالکل موموم سی شکل اختیار کر چکا ہو۔ اس کی زندگی گزارنے کا سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ان نام مصیبت کوٹھائے۔ کیونکہ شاہد جو کچھ دے گیا تھا وہ رقم بہت مختصر سی تھی۔ لیکن اس نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ جہاں بھی رہے گا تنخواہ بھیجتا رہے گا۔

(۵)

شاہد کو گئے چار سال کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن نہ کوئی خط آیا۔ نہ روپیہ جو کچھ رقم موجود تھی صابرہ نے نہایت کفایت شعاری سے صرف کی۔ اور اب سلائی وغیرہ پر نوبت پہنچ گئی تھی۔ ایک ایک دن اس کے لئے کوہ الم معلوم ہوتا تھا۔ روزانہ ہر وقت اُسے شاہد کا خیال رہتا۔ ہر گھڑی شاہد کی شکل اس کی نظروں میں پھر ا کرتی۔ وہ ہر چیز میں صرف شاہد کو دیکھتی تھی اکثر اوقات جب اس کی مہربان ہمسائی اس کی خیریت پوچھنے اور مزدوری دینے کو آتی تو اُسے شاہد کا دھوکہ ہوتا۔ جب کبھی باہر نظر اٹھا کر دیکھتی تو اُسے ہر شخص پر شاہد کا لگان ہوتا۔ لیکن شاہد نہ آج آتا تھا نہ کل انتظار ایک ہیبتناک جن کی طرح صابرہ پر سوار ہو گیا۔ اور اس کی زندگی کو گریہ و زاری، درد و کرب میں تبدیل کر دیا۔

راتوں کو اکثر سوئے سوئے وہ جاگ اُٹھتی۔ اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے لگتے ”شاہد تمھاری جدائی نے بہت تڑپایا۔ دیکھو روئے روئے میری کیا حالت ہو گئی ہے؟“

وہ ان الفاظ کے ساتھ ہی اُٹھ بیٹھتی۔ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگتی دوڑ کر دروازہ کے پاس پہنچتی۔ دروازہ کھول دیتی، باہر غور سے نظر دوڑاتی۔ جہاں صرف شفات چاندنی پھیلی ہوئی ہوتی اور ہر طرف سناٹا طاری رہتا۔ اس منظر سے اس کے دل پر ادھ چوٹ لگتی۔ وہ ویسے ہی دروازہ کھلا ہوا چھوڑ کر واپس آجاتی۔ پلنگ پر لیٹ جاتی روتے روتے اور کروٹیں بدلتے بدلتے صبح کر دیتی۔

شاہد کے انتظار میں وہ بالکل دیوانہ بن گئی تھی، پانی کا کٹورا اُٹھا کر منہ تک لے جاتی تو اُسے پانی میں شاہد کا چہرہ دکھائی دیتا۔ وہ پانی پینا بھول جاتی بعض اوقات آدھا آدھ گھنٹہ تک اُسے دوسری گھونٹ پینے کا خیال نہ آتا

بار بار شاہد کا تصور اُسے اس قدر بخود بنا دیتا۔ کہ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھٹ کر گر پڑتا۔ اور اُسے خبر نہ ہوتی۔

(۶)

چھ سال ہو گئے لیکن شاہد کا کہیں پتہ نہ لگانہ کوئی خط آیا۔ صابرہ کی ہمسائی اس پر بہت مہربان تھی، اُسے صابرہ سے محبت تھی اور انتہائی الفت۔ وہ صابرہ کی اس درد انگیز حالت کو دیکھ کر بہت کڑھتی تھی۔ وہ صابرہ کا غم غلط کرنے کے لئے اپنی فرصت کا تمام وقت اُسی کے پاس رہ کر گزار دیتی اور ہر طرح اسکو تسکین دیتی۔ صابرہ کی اس دردناک حالت پر اُسے بہت ترس آتا تھا۔ وہ اس کے غم و الم کو رنج کرینی دل و جان سے متمنی تھی۔ لیکن اس کا دور کرنا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ صابرہ اپنی ہمسائی کی باتوں کو غور سے سُنتی۔ اس سے کسی قدر اس کی تسلی ہو جاتی۔ لیکن بعض مرتبہ شاہد کی یاد اس سے اور تازہ ہو جاتی۔ اس سے برداشت نہ ہوتا اور وہ رونے لگتی۔ اس کی ہمسائی بھی مجبوراً اس کا ساتھ دینے لگتی

انتظار ایک لاتناہی انتظار تھا جسے صابرہ نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا تھا۔ وہ سمجھنے لگی تھی کہ خدا نے اُسے اسی انتظار کے لئے پیدا کیا ہے وہ جاننے لگی تھی کہ اسی انتظار میں اس کی زندگی ختم ہونیوالی ہے۔ تاہم اس انتظار میں کبھی کبھی اُسے اُمید کی جھلک بھی نظر آ جاتی۔ ایک طرف افریں اُمید۔ شاہد سے ملاقات کی اُمید اور اُسے کچھ دیر کے لئے سکون حاصل ہو جاتا۔

ایک دن شام کو جب وہ خاموش بیٹھی کوئی کپڑا سی رہی تھی۔ دروازہ پر دستک کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر گرتی پڑتی دروازہ کی طرف دوڑی۔ اس کا دل فرط جوش سے سینہ میں اُچھلنے لگا اس کے قدم نہ اُٹھتے تھے۔ دروازہ کھل گیا، لطیف سامنے کھڑا تھا۔

صابرہ یہ منظر دیکھ کر سکتے کی حالت میں آگئی۔ اُسے اُمید کچھ اور تھی اور نظر آیا کچھ اور، اُس کی اُمید کے خلاف لطیف نے محبت بھری نظروں سے اپنی خالہ زاد بہن کی طرف دیکھا۔ اُسے ایک نامعلوم کیفیت کا احساس ہوا۔ جو اس کے جسم کے ہر رگ وریشہ میں برق کی طرح سرایت کر گئی۔ صابرہ چونک پڑی اور بیاختہ بھائی بھائی لکھ کر لطیف کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ آنسو۔ محبت کے آنسو۔ درد کے آنسو۔ خون کے آنسو دونوں کی آنکھوں میں ڈبڈبا رہے تھے۔

(۷)

لطیف کی آمد نے صابرہ کے صحیفہ زندگی کا دوسرا ورق الٹ دیا۔ صابرہ کے جذبات نے کروٹ لی۔ چھ سال کی سوئی ہوئی خواہشیں آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھیں۔ لطیف کے جسم کو جب اس کے ہاتھوں نے مس کیا تو اس کو اپنے اندر خون کی ایک گرم لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور وہ جذبہ ایک انوکھی کیفیت میں ظہور پذیر ہوا۔ انوکھی اور بالکل عجیب۔ ”محبت“۔

لطیف کی عمر ابھی تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ایک تندرست توانا اور خوش رو جوان تھا اس کی شادی ہو چکی تھی۔ لیکن بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ شاہد سے ملنے کے لئے آیا تھا لیکن یہاں کا عجیب سمان دیکھ کر وہ بھی کچھ اور محسوس کرنے لگا۔ یعنی صابرہ سے ایک دلی تعلق اور یہ بات دونوں پر منکشف ہو گئی۔ کہ ان دونوں کے تعلقات میں بھائی بہن کے رشتہ سے مختلف کچھ اور کیفیات پائی جاتی ہیں لیکن یہ جذبہ مخفی طور سے ترقی پذیر ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کسی کو اس کے اظہار کی جرأت نہ تھی کیونکہ ابھی دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کا احترام موجود تھا۔

لطیف، تنہائی کے خیال سے صابرہ کے پاس نہ رہتا تھا۔ بلکہ اس نے علیحدہ مکان لے رکھا تھا۔ اس خوف سے کہ لوگ کسی قسم کا شبہ نہ کریں۔ اس طرح صابرہ کو بھی اطمینان ہو گیا۔ لطیف روزانہ صابرہ کے پاس آتا تھا اور تمام وقت اس سے باتوں میں گزار دیتا تھا۔ اس طرح محبت کے پیگ بڑھتے جا رہے تھے۔ صابرہ شاہد کو کچھ بھولنے لگی۔ اُسے لطیف کی باتوں میں بہت لطف حاصل ہوتا۔ اور وہ بہت غور سے اُنہیں سنا کرتی تھی۔

کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ ایک دن شام کو جب صابرہ صحن میں بیٹھی ہوئی آسمان پر ادھر ادھر اُدھڑا دھڑا نیوے ابر کے ٹکڑوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ لطیف مکان میں داخل ہوا۔ وہ سرور تھا اس کے چہرہ سے سکون ٹپک رہا تھا۔ صابرہ نے دیکھا نگاہیں خمی کر لیں۔ وہ آکر قریب ہی بیٹھ گیا۔ اور کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ صابرہ میں آج تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں شاید تمہیں ناگوار گذرے۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ تم یونہی کب تک انتظار کرو گی؟ صابرہ کے دل میں اس سوال سے ایک عجیبی سی پیدا ہو گئی وہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ لطیف کو اس سوال کا کیا جواب دے؟ بمشکل تمام اس نے کہا۔ تمہارا کہنا ٹھیک ہے لطیف۔ مگر میں مجبور ہوں لطیف:- چھ برس کے بعد مجبوری؟ صابرہ تمہیں اپنا خیال کرنا چاہئے۔ تم نے بہت کافی انتظار کر لیا ہے۔ صابرہ:- لیکن تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟

لطیف:- میرا مطلب؟ — صابرہ تم خود سمجھ سکتی ہو۔ لطیف تمہاری ہر خدمت کے لئے تیار ہے یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا اور صابرہ کے چہرہ پر آنکھیں کڑا دیں۔ صابرہ لطیف کے آخری جملہ پر غور کر رہی تھی اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اپنے ناخن پر نظریں جمائے تھی۔ اس نے دیکھا — اس نے تصویر میں دیکھا کہ شاہد سامنے کھڑا ہے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بہت دیر تک وہ آنکھیں بند کئے رہی۔ لطیف سکوت کے ساتھ صابرہ کی ان وجدانی کیفیات کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اور اس کی محبت اور شوہر پرستی کی عبادت کا، جو اس کی حرکات سے سرزد ہو رہی تھیں مطالعہ کرتا رہا۔ صابرہ نے یکایک آنکھیں کھول دیں۔ اُسے شاہد کے آئینی نئی اُمید پیدا ہو گئی۔ اس نے لطیف سے کہا۔ ”لطیف ابھی ایک سال اور انتظار کرو۔“

(۸)

انتظار کی گھڑیاں، ہزاروں ارمان اور آرزوؤں کے ساتھ گزرتے لگتے اور دونوں کے لئے ایک ہی طرح کی بچپان پیدا کرنے لگتے۔ لطیف صابرہ کے عیش و آرام کا خیال حد درجہ ملحوظ رکھتا تھا اس نے اس کی آسائش کیلئے ہر قسم کا سامان مہیا کر دیا تھا۔

دن گزر گئے — ہفتے گزر گئے — مہینے گزر گئے — سال ختم ہونے لگا اور صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تو لطیف نے صابرہ سے دریافت کیا کہ شادی کی تیاریاں شروع کر دی جائیں۔ صابرہ نے جواب دیا ابھی ایک برس اور ٹھہرو شاہد کی یاد صابرہ کے محبت آمیز دل میں ابھی تک باقی تھی۔ ابھی شاہد کا تصور کلیخت فنا ہوا تھا۔ لطیف کی تمنا تھی کہ جلد یہ وقت کسی طرح گزر جائے۔ صابرہ کی آرزو تھی کہ یہ دن بڑھتے چلے جائیں شاید اس اتنا دین شاہد آجائے۔ دوسرا سال بھی گزر گیا

صابرہ نے لطیف سے خواہش کی کہ ابھی ایک ماہ اور صبر سے کام لو۔ لطیف کو مجبوراً صابرہ کی باتوں کو ماننا پڑتا تھا

اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن اب اُسے یقین ہو گیا کہ یہ زمانہ بہت قلیل ہے۔ اور شاید اب عقد میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔ ایک ماہ کا زمانہ ختم ہو گیا۔

لطیف نے ایک دن صابرہ سے پوچھا۔ صابرہ آج ایک ماہ بھی ختم ہو گیا۔ اور اب شاید تمہیں کوئی عقد نہ ہوگا اگر شاہد کو آنا ہوتا تو وہ اب تک جاتا

صابرہ نے جواب دیا:۔ ہاں لطیف یہ سب ٹھیک ہے لیکن اُمید بردنیا قائم ہے اگر دو ہفتے اور انتظار کرو تو کیا بچ ہو لطیف!۔ اچھا تو دو ہفتے میں اور ٹھہر سکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے تمام سامان کر لینا چاہئے صابرہ:۔ جیسی تمہاری مرضی ہو۔ لیکن میرا تو یہ خیال ہے ایک ہفتہ کے بعد شروع کرنا لطیف:۔ جیسا تم کو۔

ایک ہفتہ بھی باتوں ہی باتوں میں گزر گیا۔ صابرہ کی آنکھیں انتظار میں پھرائیں۔ لیکن شاہد کو نہ آنا تھا نہ آیا صابرہ نے خیال کیا کہ اب انتظار فضول ہے اور شاہد کی واپسی ناممکن شکل اختیار کر چکی ہے آٹھ برس گزرے لیکن کوئی خبر نہیں آئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ اس کا دل فیضانِ غم سے بھرا آیا۔ وہ رونے لگی۔ رات بھر روتی رہی

(۹)

نکاح کا دن تھا۔ لطیف نے اپنے اور صابرہ کے لئے کپڑے وغیرہ بنوائے تھے اور تمام ضروری سامان لا کر صابرہ کو دیا تھا۔ صبح وہ کچھ اور چیزیں لایا۔ اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ شام کو قاضی کو نیکر آئیگا۔ صابرہ نے تمام چیزیں لے لیں۔ اپنی ہمسائی کو یہ واقعہ پہلے ہی بتا دیا تھا۔ وہ اس عقد کو سنگر بہت خوش ہوئی۔ اس نے عمدہ عمدہ کھانے پکا کر تیار کئے اور شام کو اُسے کپڑے پہنا کر دوسرے بنا دیا۔ اور خود اس کے پاس بیٹھی رہی۔ جب لطیف کے آنے کا وقت قریب ہو گیا تو صابرہ کے کہنے سے اس کی ہمسائی نے کھانا برتنوں میں نکال کر ایک علیحدہ کمرہ میں جن دیا۔

اب صابرہ تنہا بیٹھی تھی۔ اور معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہی تھی۔ یکایک دیوار میں لگا ہوا تختہ کھونٹی نکل جانے لگی وجہ سے اُلٹ گیا۔ اور اس پر رکھی ہوئی گھڑی نیچے گر کر چور چور ہو گئی۔ صابرہ اس اچانک حادثہ سے گھبرا گئی۔ وہ اٹھ کر گھڑی کے ہس آئی۔ دیکھا تو وہ ٹوٹی پڑی ہے۔ یہ گھڑی اس کے والد کی نشانی تھی جسے وہ بہت عزیز سمجھتی تھی۔ اور انتہائی تکلیف کے وقت بھی اُسے فروخت کرنے کا خیال نہ کیا تھا۔ اس اثنا میں ہمسائی بھی گھبرائی ہوئی آگئی۔ اور اس نے پوچھا کیا ہوا؟

صابرہ نے حسرت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ گھڑی آپ ہی آپ گر کر ٹوٹ گئی ہمسائی نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا۔ یہ شگون تو اچھا نہیں ہے

یہ سن کر صابرہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یوں تو ٹوٹنے ہی کا صدمہ اُسے کیا کم تھا مگر اب اس شگون کو سُکر۔ اور بھی قلع پیدا ہو گیا۔ لیکن آنیوالی گھڑیاں زیادہ نازک تھیں اور چونکہ مستقبل میں عشرت کی چمک نظر آرہی تھی اس لئے اُس نے اس واقعہ کا زیادہ خیال نہ کیا اور لطیف کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ ”سات بج چکے تھے“ اس وقت صرف صابرہ مکان میں تھی۔ اس کی ہمسائی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ دروازہ کی کُندھی کھٹکھٹانیکی آواز آئی۔ دروازہ کھولنے کو کوئی اور موجود نہ تھا۔ خود صابرہ کو اٹھنا پڑا۔ اُس نے خود جا کر دروازہ کھول دیا۔ اُسے یقین تھا کہ لطیف آیا ہوگا۔ مگر اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ایک شخص ایک صندوق اور بستر لے ہوئے کھڑا ہے صابرہ کو دیکھ کر مژدور نے کہا: یہ سامان شاہد میان نے بھیجا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آئینگے۔

یہ لفظ بجلی کی طرح صابرہ کی آنکھوں میں کودنے لگا۔ اُسے معلوم ہوا کہ زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ تخت انشرویٰ میں دہنستی چلی جا رہی ہے اس وقت اس کے اضطراب قلب اور بدحواسیوں کا منظر دیکھنے سے قلع رکھتا تھا۔ وہ جون کی تون گھڑی رہی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی، جسے وہ خود نہ سمجھ سکتی تھی۔ وہ کچھ دیکھ رہی تھی لیکن اُسے سب بالکل خواب معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے اس مزدور کی آمد کو محض ایک تصور سمجھا۔ مزدور نے پھر کہا۔ یہ سامان اندر رکھ دو یا باہر ہی۔ اب صابرہ کو ہوش آیا اس نے مزدور کو پردہ میں ہو کر اندر بلا لیا۔ وہ سامان رکھ کر چلا گیا۔ یہ سامان ایک صندوق تھا جس پر شاہد کا نام لکھا تھا اور جسے صابرہ بیچا کرتی تھی۔ اور ایک بستر

اس کی سمجھ میں اب کچھ نہ آتا تھا کہ اس شادی کا اب کیا انجام ہوگا۔ اور وہ شاہد کو اس کا کیا جواب دے گی۔ تاہم اسکے افسردہ دل و دماغ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسرور ہو گئی۔ اس کے رخساروں میں گلابی رنگ عود کر آیا۔ تبسم ہونٹوں پر چمکنے لگا۔ وہ نئے سرے جوان ہو گئی۔ اتنے میں ہمسائی بھی آگئی۔ صابرہ نے اس سے سارا حال بیان کر دیا۔ اور سامان بھی دکھایا۔ ہمسائی نے پوچھا۔ پھر اب لطیف کو کیا جواب دو گی؟

صابرہ نے جواب دیا:۔ کیوں؟ میں سب حال اُن سے کہہ دوں گی

ہمسائی بولی:۔ لطیف ابھی تک نہیں آئے۔ آٹھ بجے چاہتے ہیں۔ اب میں جاتی ہوں ضرورت ہو تو بلا لیتا ہمسائی چلی گئی صابرہ اب بچہ نہ رہی۔ اور شاہد کا خیال اب اس کے دماغ میں سما یا ہوا تھا لطیف کے متعلق گویا وہ بالکل کچھ جانتی ہی نہ تھی۔ لطیف نے دروازہ پر قدم رکھا تو وہ چونک پڑی۔ لطیف اُسے لباس عروسی میں دیکھ کر خوش ہو گیا۔ وہ اندر داخل ہو کر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ صابرہ نے کہا۔ ”لطیف تم کچھ اور بھی سنا؟“

لطیف نے کسی قدر گھبرا کر سوال کیا:۔ کیا؟

صابرہ نے جواب دیا:۔ تمہارے بہنوئی کا سامان آیا ہے اور وہ آنے ہی دے ہیں

اس جملہ نے لطیف کی ساری تनावل پر پانی پھیر دیا۔ اس پر یہ الفاظ صاعقہ بن کر گرے اسکے جذبات میں

ہل چل پھوٹ گئی۔ وہ بالکل دیوانہ سا ہو گیا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلتی تھی۔ بمشکل تمام اس نے کہا: ”اچھا تو صبر“
میں جاتا ہوں پھر آؤنگا“ یہ لکھ کر وہ چلا گیا

(۱۰)

۹ بج گئے۔ دس بج گئے۔ گیارہ بج گئے۔ شاہد کا ابھی تک پتہ نہ تھا۔ صابرہ بار بار دروازہ کھول کر جھانکتی لیکن
سڑک پر سناٹا چھا رہا تھا۔ یا کبھی کبھی دوڑ جانیو اے لوگوں کے قدموں کی آواز گوش گزار ہوتی تھی، جن پر اُسے شاہد کے
آنیکا دھوکہ ہوتا تھا۔ وہ تنہا بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ اس نے ہمسائی کو بھی نہ بلایا کہ اس کی نیند خراب ہو گئی۔ انتظار رہی
انتظار میں بارہ بج گئے۔ نیند اس کی آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔ اُسے ہر وقت یہی معلوم ہوتا تھا کہ شاہد اب آنا ہی چاہتا ہے۔
اس ایک خیال کے ساتھ نئی نئی اسنگون اور طرح طرح کے ولولوں کا اس کے دل پر اثر سا چھا جاتا۔ اور وہ خود کو بہت
خوش نصیب سمجھنے لگتی۔ لیکن جب پھر گھنٹا بجنے کی آواز آتی۔ تو یہ خیال یا اس کی کھٹا بجاتا۔ اور پھر نظروں سے اوجھل
ہو جاتا۔

دو بج گئے۔ تین بج گئے۔ چار بج گئے۔ شاہد کی صورت اب تک نظر نہ آئی تھی لیکن صابرہ، وفا کی دیوی،
پیت کی ماری، پتی کی بچاری، اب تک لباس عروسی میں بیٹھی گرسنہ نکلا ہوں سے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ کھانا دسترخوان پر
رکھے رکھے برت ہو چکا تھا۔ صبح ہو گئی

ہمسائی صابرہ سے ملنے کو آئی۔ اس نے دیکھا تنہا صابرہ بیٹھی ہوئی ہے اُسے تعجب ہوا کہ کیا معاملہ ہے اس نے حیرت
سے پوچھا:۔ تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو؟ شاہد نہیں آئے۔
صابرہ نے جواب دیا:۔ نہیں ابھی تک تو نہیں آئے۔

ہمسائی بولی:۔ پھر اب کیا ارادہ ہے۔

صابرہ نے کہا:۔ کچھ نہیں۔ شاید اس وقت آجائیں۔

دن بھر اسی اُمید افزا انتظار میں گزر گیا لیکن شاہد نہ آیا۔

(۱۱)

شاہد گاڑی سے اتر کر اسٹیشن کے باہر آیا۔ اس نے ایک مزدور کو اپنا سامان دیکر اپنے گھر کا پتہ بتا دیا تھا۔ اور سامان
پہنچانیکو کھدیا تھا۔ وہ خود ایک ہوٹل میں کسی ضرورت سے ٹھہر گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ وہاں سے نکل کر گھر کی طرف
روانہ ہوا تو۔ راستہ میں ہسپتال کی آواز سنائی دی۔ گولی، شاہد کو لگی اور وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ پولیس نے اُس کو ہسپتال
پہنچا دیا۔

لطیف کا دل ٹوٹ گیا تھا وہ نہایت مغموم تھا۔ مغموم اور مضطرب بھی۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا

وہ سب کچھ کرنے سے مجبور تھا۔ دوسرے کی چیز پر کسی کا کیا بس؟ وہ اپنی نادانی پر تاسف کرتا رہا۔ اس نے اب صابرہ کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا اور اس کی طبیعت بھی نہ چاہتی تھی۔ دوسرے روز وہ وہاں سے اپنے گھر واپس چلا گیا۔ شاہد کے انتظار میں دن گزرے، راتیں گزریں۔ ہفتے گزرے، مہینے گزرے اور سال تک نوبت آپہنچی پھر اس کی کوئی خبر نہ معلوم ہوئی۔ کہ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ ”کئی سال گزر گئے“

صابرہ کی امیدیں ناکامیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اس کی جوانی انتظار کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اُنارہی جا چکی تھی اس کی شوخیان سنجیدگیوں میں کم ہو چکی تھیں، اس کی رعنائیاں صنعت کا نقشہ بن گئی تھیں۔ اس کا حسن لٹ چکا تھا اس کی شوہر پرستی ایک تصویر خیالی بن کر رہ گئی تھی۔ اور وہ ایک ڈھانچہ تھی۔ چند بڑیوں کے مجموعہ کا۔ ایک ضعیفہ تھی جس کے بالوں میں سین چمک تجربہ کاری کی منظر تھی۔ اس کے چہرہ پر جھڑپاں بڑ گئی تھیں اور اس کی مینائی میں بھی فرق پیدا ہو گیا تھا۔

”اب بھی صابرہ شاہد کا انتظار کر رہی تھی“

صابرہ میں اب صرف سانس باقی رہ گئی تھی۔ ورنہ حقیقی معنوں میں وہ مردہ تھی۔ یہ سانس صرف شاہد کے نام سے وابستہ تھی۔ کہ شاہد اب بھی شاہد آجائے۔

دنیا گردش کرتی رہی، سورج نکلتا اور غروب ہوتا رہا۔ چاند جگمگا تا اور چھپتا رہا۔ دن رات آتے جاتے رہے۔ سردی اور گرمی اپنے اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوتی رہتی۔ لیکن شاہد بالکل خیال، اور خیال سے بھی نازک کوئی شے بن گیا تھا۔ جو دل میں بھی نہ آسکتا تھا۔

ایک رات جب تمام آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بجلی زور زور سے کوند رہی تھی! در بادل گرج رہے تھے۔ پانی کی موسلا دار بارش ہو رہی تھی۔ صابرہ اپنے گھر میں بیٹھی ہوئی قدرت کے ان بھیانک مناظر کا اکیلی مشاہدہ کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس بارش اس رات کی تاریکی، چمکنے والی بجلی اور گرجنے والے بادلوں سے شاہد کا پتہ پوچھ رہی تھی۔ یکایک دروازہ کھل گیا۔ لیکن اُسے خبر نہ ہوئی وہ معلوم نہیں کس خیال میں مچو تھی۔ وہ دفعۃً چونک پڑی۔ اس نے دیکھا۔ غور سے اور ہنکھیں گڑا کر، سامنے ایک انسان کھڑا تھا۔ ایک لاغر، نحیف اور لمبی داڑھی والا انسان جس کا تمام جسم پانی سے تر تر ہو رہا تھا۔ آئینوں کے منہ سے نکلا۔ ”صابرہ“۔ اور صابرہ آندھی کی طرح اُٹھی اور تیر کی طرح اس کے پاس جا پہنچی مگر صرف یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے۔ ”شاہد مجھے تمہارا ہی انتظار تھا“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ شاہد کے گلے میں ڈال دیے اور اس کی روح شاہد کے پاس سے پھر اس کے جسم میں واپس نہ آئی

محشر عابدی

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

فتح ہندوستان کے مختلف مناظر

سرجان سلی کے پانچ لکچرون کا ترجمہ دسمبر ۱۹۳۷ء تک شائع ہو چکا ہے۔ چھپے لکچر کا ترجمہ ہے یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا اسکا حاصل یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسا نتیجہ پیدا ہوا جو آناجیرت انگیز نہیں جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ نتیجہ اپنی عظمت کے لحاظ سے ضرور قابلِ لحاظ ہے اور پھر اس سے آئندہ جو نتائج پیدا ہونے والے ہیں وہ بھی نہایت بہتم نشان ہیں

اس سے قبل میں نے اس سلطنت کی ایک خصوصیت پر زور دیا تھا کہ جو قوت اس سلطنت کو انگلینڈ سے وابستہ کرتی ہے بالکل برائے نام ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سلطنت ہندو آبادیات سے مشابہ ہے، البتہ ان دونوں میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ ہماری خاص نوآبادیان اکثر معاملات میں اپنی حکمت عملی کا تعین خود کرتی ہیں کیونکہ وہ ان کی حکومت مجلس قانون ساز کی ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے اور ہندوستان کو ایسی آزادی رائے حاصل نہیں ہے، یہاں تک کہ وائسرائے بھی اپنے فیصلوں میں سکرٹری آف اسٹیٹ کا تابع ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بڑی مشابہت ان دونوں میں ہے کہ ہندوستان نوآبادیوں کی طرح ہمیشہ الگ رکھا گیا، اسکو ہوم گورنمنٹ سے کبھی اسقدر قریب نہیں ہونے دیا گیا کہ اسکے ساتھ مل جائے یا اسکی صورت میں تبدیلی پیدا کر دے یا اسکے آزادانہ ارتقا میں مزاحم ہو سکے۔ ہندوستان، نظام حکومت اور اقتصادی اعتبار سے ایک آزاد سلطنت ہے۔ اگر سلطنت مغلیہ اپنی اسی قوت کیساتھ آج تک باقی رہتی تو انگلینڈ کی تاریخ خارجی معاملات میں آج سے بہت زیادہ مختلف ہوتی۔ فرانسیسون کے ساتھ ہماری لڑائیوں کا رخ اور ہی کچھ ہوتا خصوصاً اس جنگ کا جس میں بوناپارٹ کی مصری ہم ایک خاص واقعہ ہے۔ ہمارے خیال میں جنگ کو تیسرا کبھی نہ ہوئی اور نہ ہم جنگ ترکی و روس میں اسقدر دلچسپی لیتے۔ لیکن حکومت انگلینڈ کا کانسٹی ٹیوشن بجنسہ ہی ہوتا اور ہماری خانگی تاریخ کی رو بھی بالکل وہی ہوتی جو آج سے ہمارے خیال میں صرف ایک مرتبہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان پارلیمنٹ کی بحث میں شریک ہوا، اسوقت اسنے ساری سیاسی دنیا کی توجہ جذب کر لی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے عذر میں بھی جب کہ ہمارے جذبات حدودِ مجہ مشتعل تھے، ہماری خانگی سیاست کی رو پر ہندوستانی معاملات کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

اس لئے اگر سلطنت ہند ہم خود دین تو اسکے فوری اور خاص سیاسی اخراجات کچھ زیادہ قوی نہیں ہونگے سکرٹری

آف اسٹیٹ کا عہدہ ختم ہو جائیگا، پارلیمنٹ کا کام ہلکا ہو جائیگا اور ہماری خارجی پالیسی پر سے ایک بڑا بھاری بوجھ اتر جائیگا۔ انکے علاوہ اور فوری تغیرات کچھ زیادہ نہ ہونگے۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ سلطنت ہند اس معنی میں نوآبادیوں سے مشابہ ہے اور اسکے اندر ہم توسیع انگلستان کی وہ خصوصیت پاتے ہیں جو میرے ان لکچرون کا موضوع ہے۔ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ یہ توسیع نظراول میں عضلاتی نمو (muscular growth) کی قسم کی نہیں معلوم ہوتی۔ جب بچہ بڑھ کر مرد ہو جاتا ہے تو بچہ غائب ہو جاتا ہے۔ اسکے اندر کوئی ایسی تری نہیں ہو جاتی جو پہلے بچے سے مختلف ہو۔ یا کوئی ایسی چیز نہیں مل جاتی جو اس کی علامت کی جاسکے لیکن انگلینڈ کی توسیع ٹھیک نین معنوں میں ہوئی ہے۔ کیونکہ اصلی انگلینڈ اب بھی برطانیہ کلان کے قلب میں جکسے نظر آ رہا ہے۔ اُسکے اعضاء و ترکیبی بذات خود مکمل ہیں۔ ابھی تک اُسے اپنے ساتھ ہندوستان اور نوآبادیوں کا خیال ہی نہیں کیا اور نہ اسکی عادت ڈالی۔

ٹرگوت (Trugot) نے نوآبادیوں کی مثال اُس پھل سے دی تھی جو صرف پکے تک درخت سے ٹکتا رہے تمام انگریزی اقوام کو مقابلہ ایک فرد کے ایک خاندان سے تشبیہ دینا یقیناً زیادہ موزوں ہو گا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملکہ الیزبتہ کے عہد کے انگلینڈ کا ایک سیس کنبہ دور دراز سمندر پار ممالک میں پھیلا ہوا ہے، جسکے اندر غالب حصہ خوشحال نوآبادیوں کا ہے لیکن اُسکے اندر ایک ایسا کارپوریشن بھی شامل ہے جو تجارت کرتے کرتے خوش قسمتی سے ایک عظیم الشان ملک پر تسلط ہو گیا۔ اس قسم کا خیال کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ یہ خیال خیال، کی حد سے متجاوز ہو کر دلیل و حجت نہ بن جائے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ خاندان، کم از کم موجودہ سوسائٹی کے رواج کے مطابق اخطا پذیر ہوتا ہے۔ جب تک لڑکے چھوٹے ہوتے ہیں اس میں اتنا ہوتا ہے، بعد ازاں یہ ایک باہمی عہد و پیمان کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر جب لڑکے بڑے ہو جاتے ہیں تو یہ عہد و پیمان بھی ڈھیل پڑ جاتا ہے۔ آخر الامر جب لڑکے جوان ہو کر تلاش روزگار میں ادھر ادھر نکل جاتے ہیں اور لوکیان بیاہ دی جاتی ہیں تو پھر خاندان میں عملی طور پر کوئی عہد و پیمان باقی نہیں رہتا بلکہ اکثر ہمیشہ کے لئے اسکے ارکان میں کوئی رشتہ باقی نہیں رہ جاتا۔ ہم اپنی سلطنت کو ایک خاندان کہہ سکتے ہیں لیکن بنیادی تحقیقات یہ فرض نہیں کر سکتے کہ اسکا بھئی ہی حشر ہو نیوالا ہے۔ کیونکہ وہ اسباب جو خاندانوں کی شکست کے باعث ہوتے ہیں ٹھیک حکومتوں کے نہیں ہوتے۔ یہ امر خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے کہ اب اُن اسباب کا اثر اس قدر نہیں ہوتا جس قدر پہلے ہوا کرتا تھا۔ ٹرگوت اور انقلاب امریکہ کے زمانہ میں البتہ ایک دور افتادہ محکوم ملک کو اس لڑکے سے تشبیہ دیتے تھے جو مکان چھوڑ کر عملی طور سے خاندان سے الگ ہو گیا ہو۔ لیکن زمانہ حال میں ایسا نہیں ہے کیونکہ ایجادات نے سارے کوہ زمین کو سمیٹ کر ایک جگہ کر دیا ہے۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ اور روس میں ایک ایسی جدید طرز کی اور اتنی وسیع سلطنت قائم ہو گئی ہے جسکا گزشتہ زمانوں میں کسی کو علم بھی نہیں تھا۔ چونکہ انگلینڈ کا تعلق نوآبادیوں اور ہندوستان سے حیرت انگیز طریقہ پر بہت کم رہا ہے لہذا قدرتا ہوا کہ اس تعلق کے نتیجہ پر غور کرنے میں تامل ہو گا۔ لیکن نتیجہ بالکل واضح ہے۔ نوآبادیوں کے متعلق میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ اگرچہ بڑی

انکا تعلق مادر وطن سے کم تھا، تاہم یہ تعلق رفتہ رفتہ بجائے کمزور ہونے کے زیادہ استوار اور ترقی پذیر ہوتا جاتا ہے۔ نوآبادیات اب ہم سے بہت زیادہ قریب ہو گئی ہیں، گزشتہ زمانہ میں جو خرابیاں ان کے اندر تھیں دور ہو گئیں اور اب تو وہ ہماری فاضل آبادی کیلئے ایک قدرتی نکاس کا کام دیتی ہیں۔ برصغرات اسکے اگلے وقتوں میں جب آبادی اس قدر فاضل نہیں تھی تو نوآبادیوں میں بالعموم بدول بنا ہلکڑیں آباد ہوتے تھے، جو وطن سے برسرِ عناد ہوتے تھے۔ یہی اصول ہمارے تعلق ہندوستان میں کارفرما ہے وہ قوت جیسے اس تعلق کی بنا ہے۔ کمزور ہے۔ انگلینڈ نے اس تعلق کو جس سے اپنی ترقی روکی نہیں۔ اگرچہ یہ سلطنت (ہندوستان) بہت بڑی ہے لیکن انگلینڈ آج بھی ویسا ہی ہے جیسا اسکے حصول سے قبل تھا۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ تعلق کو صدیوں سے قائم ہے لیکن ہر وقت ٹوٹ سکتا ہے۔ اور اسکی وجہ سے ہمارے خانگی انتظام میں کوئی اتیری نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر اس کے کمزور ہونے کی وجہ سے یہ مستحکم ہو کہ جلد یا بدیر اسکو شکست ہونا ہے تو قبل ازیں کہ ہم اس استنباط کو تسلیم کریں ہمیں ایک اور مسئلہ پر غور کرنا چاہئے یعنی یہ کہ اسکا میلان کس رخ پر ہے۔ آیا یہ بؤدا تعلق رفتہ رفتہ ڈھیلا ہوتا جاتا ہے یا زمانہ کے ساتھ ساتھ زیادہ مضبوط۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ نوآبادیوں کی طرح زمانہ کا میلان جس نے عظیم اٹلان سیاسی اتحاد کے امکان کو قوی بنا دیا ہے ہندوستان اور انگلینڈ کے باہمی تعلق کو بجائے ضعیف کرنے کے قوی تر کر رہا ہے۔

ہندوستان نے اپنی تصنیف ”ہندوستان“ میں ہندوستان کے متعلق جو نوٹ لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے کہ اجارہ داری کے زمانہ میں یعنی ۱۸۷۵ء میں انگلینڈ اور ہندوستان کی تجارت نہایت معمولی تھی یعنی اسکو اتنی بھی اہمیت نہیں حاصل تھی جتنی انگلینڈ اور جرمنی یا *Germany* کی تجارت کو تھی۔ لہذا اگر تجارت دو قوموں کو متحد کرنے کے لئے کوئی خاص رشتہ ہو سکتی ہے تو ہم اسکے میلان اور اسکی قوت کا ایک معیار قائم کر سکتے ہیں، خواہ یہ میلان اتحاد کی جانب ہو یا علیحدگی کی جانب۔ چنانچہ ہم ہندوستان اور انگلینڈ کی موجودہ تجارت کا موازنہ گزشتہ تجارت سے کرینگے پرانے زمانہ میں خیال تھا کہ ہندوؤں کے عادات ناقابل تبدیل ہیں اسلئے انہیں یورپ کی مصنوعات کی کھپت نہیں ہو سکتی لیکن اب ہم ہندوستان کی تجارت کا بجائے جرمنی اور *Germany* کی تجارت سے مقابلہ کرنے کے ریاستہائے متحدہ امریکہ اور فرانس کی تجارت سے کرتے ہیں یعنی دو ایسی قوموں سے جو دنیا کی بڑی کاروباری قوموں میں شمار ہوتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ ہمکو ہندوستان سے نسبت بہت کم آمدنی ہے تاہم اسکا نمبر تجارت برآمد کے لحاظ سے فرانس اور امریکہ کے بعد ہے اور درآمد میں اسواے امریکہ اسکا نمبر فرانس اور تمام دیگر ممالک سے آگے ہے۔ کیونکہ اسی سال (۱۸۸۱ء) وہ ان کی درآمد ۲۹۰۰۰۰۰۰ تھی اور ان ممالک کی جبکہ نمبر اسکے بعد تھا جیسے اسٹریلیا اور جرمنی علی الترتیب دو کروڑ ۱۰ لاکھ اور ایک کروڑ لاکھ۔

موجودہ صدی میں جو عظیم ترقی اس باب میں ہوئی ہے اس سے تم اندازہ کرو گے کہ دو نوں قوانین بجائے ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے لگے رفتہ رفتہ قریب ہو رہی ہیں۔ لہذا اگرچہ سیاسی نقطہ نظر سے اس علیحدگی کے اثرات فوری اور

براہ راست نہیں ہونگے تاہم اقتصادی نقطہ نگاہ سے بہت ہی اہم ہونگے۔ ہکویہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ محض سیاسی تعلقات کی وجہ سے دونوں ممالک میں تجارتی تعلقات قائم نہیں، اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو شاید یہ تعلقات منقطع ہو جائیں یا اگر وہ کسی یورپ کی سلطنت مثلاً روس کے ہاتھ میں چلا جائے تو ان کا ٹوٹ جانا بالکل یقینی ہے۔ اس صدی کے شروع میں اگر ہم نے چاہا ہوتا تو نہایت آسانی کیساتھ ہندوستان سے علیحدگی کر لی ہوتی کیونکہ وہ ابتدائی لڑائیوں جو فرانسیسیوں سے بمبئی، مدراس اور کلکتہ کی کوٹھیوں کے متعلق ہوئیں ان کے اندر کوئی معقول وجہ نہیں تھی اس لئے کہ اس زمانہ میں ان مقامات پر ہماری تجارت بالکل غیر اہم تھی لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہماری تجارتی پابندیاں بہت زیادہ ہیں یعنی اب ہم ہندوستان سے بہ نسبت پہلے کے زیادہ مضبوطی کے ساتھ بندہ ہیں۔ پھر یہ بات غور کرنے کے لائق ہے کہ اس عرصہ میں انگلینڈ اخلاقی نقطہ نظر سے ہندوستان سے کس قدر قریب ہو گیا ہے۔ شروع شروع میں ہکویہ ہندوؤں کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ ہم محض تاجر تھے، سلطنت مغلیہ یا اس کے زوال سے ہکویہ کوئی سروکار نہیں تھا، ہکویہ اس سے کوئی بحث نہیں تھی کہ آیا ہندو خراب حکومت میں رہتے تھے یا صلح لوٹروں کے شکار بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہندوستان میں ہماری فتوحات کا آغاز ان خیالات کے ماتحت نہیں ہوا بلکہ ایک حد تک فرانسیسیوں سے مقابلہ کرنے اور اپنی تجارتی کوٹھیوں کو ناکامی حلقہ سے محفوظ رکھنے کے خیال سے۔ کمپنی کے قوت اعلیٰ ہو جانے کے ایک عرصہ بعد تک ہم دیسیوں کی بمبودی سے غافل رہے

۱۸۵۷ء میں یعنی دارن ہسٹنگز کے آخری ہندو حکومت کے بیان میں لکھتا ہے ”ایسی کوئی حکومت نہیں ہو سکتی جو اپنی رعایا کی صلاح سے اس درجہ غافل ہو“ یہ قدرتی نتیجہ تھا اس ناقابل اعتماد حالت کا جس میں محض گردش تقدیر سے ایک تجارتی کمپنی اچانک حکومت سے بدل گئی۔ یہ بے ضابطہ اور اس کے اثرات کمپنی کی حیات تک قائم رہے لیکن ۱۸۵۷ء سے دور ہو گئے۔ کوئی بات اب ایسی نہیں باقی رہی جس سے خود غرضی کا شبہ تک ہو سکے۔ اب ہماری حکومت سے زیادہ مہربان کوئی دوسری حکومت نہیں تھی اور جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اب ہم نے ہندوؤں کو اس اعلیٰ روشن خیالی سے جس کے ہم مالک ہیں اس بنیاد پر محروم رکھنے کا خیال کہ ان کو اسکی ضرورت نہیں ہے، ترک کر دیا ہے۔

پھر اسی کے ساتھ تاریخ برقی کے اجراء اور سفر کی سہولتوں نے۔ اول براہ خشکی بعد ازاں براہ ہندوستان کو انگلینڈ سے بہت قریب کر دیا ہے۔ لوگوں کا اکثر اعتراض ہے کہ اس تبدیلی کا اثر مضر ہے اور ہر وقت ڈاؤننگ اسٹریٹ اور اس سے زیادہ انگریزی رائے عامہ کی مداخلت بہت زیادہ مضر ہے۔ بحث کی خاطر فرض کر لو کہ واقعی ایسا ہی ہے لیکن یہاں پر سوال یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کا انگلینڈ سے زیادہ متحد رہنا مناسب ہے یا نامناسب۔ حقیقت حال تو یہ ہے کہ چاہے اچھا ہو یا برا اگر ان دونوں ممالک کے تعلقات، بجائے کم ہونے کے زیادہ ہوتے جا رہے ہیں

آؤ ایک بار پھر ہم اس رفتار پر غور کریں جس سے ہمارا تعلق ہندوستان کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ مسٹر کنگم Cunningham نے اپنی تصنیف ”برٹش انڈیا اور اسکے حکمران“ میں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے

۱۸۲۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان ہندوستان کی غیر ملکی تجارت کا برطانیہ کھان کی غیر ملکی تجارت سے مقابلہ کیا ہے یہ ترقی اکثر عظیم حیرت و استعجاب کا موجب ہوئی ہے۔ انگلینڈ کی غیر ملکی تجارت ۸۰ ملین سے ۶۵۰ ملین پونڈ ہو گئی۔ سٹرکنگھ کتا کہ اسی زمانہ میں ہندوستانی تجارت اس سے کمین زیادہ ترقی کر گئی تھی اور چونکہ ہندوستان کی بیرونی تجارت خاص کر انگلینڈ کیساتھ ہے اسلئے نتیجہ یہ نکلا کہ ان دو ممالک میں تجارتی اتحاد کا میلان نہایت ہی قوی ہے اور اگر اب سے پچاس سال تک کوئی غیر متوقع حادثہ نہیں رونما ہوا تو یہ اتحاد حد درجہ استوار ہو جائیگا

اگر ان تمام واقعات کو جو میں نے بیان کئے ہیں یکجا جمع کر کے سلطنت ہند کا تصور کیا جائے تو عجیب نتیجہ نکلتا ہے اسکی مثال سلطنت روم کے جس میں ہاری حیثیت حکمران کی تھیں ہے بلکہ محکم تہذیب و علوم کی بھی ہو جس طرح فاسٹ اور آہن کا اتحاد ایک عہد کا دوسرے عہد کیساتھ اتحاد تھا ٹھیک اسی عہد حاضر کا یورپ ایشیا کے قرن وسطی سے متحد ہو گیا جو سلطنت ہند ہمیشہ ہم سے الگ تھلک رکھی جاتی ہے، اس سے ہمیں کوئی خراج نہیں ملتا، اس کا کوئی بار ہمارے اوپر نہیں پڑتا بجز اسکے کہ ہماری خارجی حکمت عملی البتہ متاثر ہوتی ہے۔ اسکی وجہ سے ہماری خانگی سیاست میں نہ تو کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے اور نہ کوئی قابل محسوس اثر پڑتا ہے۔ اس سلطنت پر ہمارا بیچہ آہنی مردہ ایام کیساتھ بجائے سست ہونے کے زیادہ سخت ہوتا جاتا ہے ہندوستان اور انگلینڈ کا اتحاد اگرچہ غیر فطری اور نامبارک کیونکہ نہ معلوم ہو لیکن عہد حاضر کے سیاسی اتحاد کے منافی نہیں ہے جو نہایت تیز رفتاری کیساتھ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب واقعات تاریخ انگلینڈ میں سب سے زیادہ عجیب جہرناک اور غالباً نام ابواب سے زیادہ سبق آموز ہیں۔ بعض لوگوں کو اس پر فخر ہے کہ یہ کوئی طلسمی مہم تھی مگر ہے جو محض عارضی ہو۔ لیکن جو لوگ تہ تک غور کریں کہ وہ اس مہم کو کمال مایوسی کیساتھ دیکھتے ہیں لیکن چون چون زمانہ گزر جاتا ہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ایسی زبردست قدرت کے ہاتھ میں ہیں جو تمام تدبیر و سیاست پر بالاتر ہے۔ وہ انیشن جو کبھی بلا ارادہ ڈھیر ہو گئی تھیں قصر تہذیب کا ایک حصہ بننے والی ہیں اور ہندوستان جو انگلینڈ کی تمام کامیابیوں میں سب سے زیادہ عجیب تھا پائان کار سب سے بڑی کامیابی ثابت ہو گا۔

اس مقام پر پھر ہماری نظر حال سے ہٹ کر ماضی کی طرف جاتی ہے اور ہمارے دلمین سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کون سا کی بنا پر ہم نے اس مہم میں ہاتھ ڈالے؟ میں نے کامل ایک لکچر اس موضوع کی نذر کیا ہے کہ وہ کونسی طاقت تھی جسکی مدد سے ہم نے ہندوستان کے باشندوں کو اپنی حکومت کا مطیع کیا۔ لیکن موجودہ سوال اس سے مختلف ہے۔ وہ سوال تھا ”کس طرح؟“ اور یہ سوال ہے ”کیون؟“ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سلطنت بغیر کسی غیر معمولی طاقت و قابلیت کے قائم ہو گئی۔ لیکن سوال ہے آخر اسکے قیام کا محرک کیا تھا۔ اسکی تعمیر میں کتنی معزز، بہادر اور جفاکش ہستیاں قربان کرنا پڑیں؟ انھوں نے اپنی جانیں کیون قربان کیں؟ اگر انھوں نے خود بخود ایسا نہیں کیا بلکہ کسی حکم کی تعمیل میں تو وہ کون سی طاقت تھی جس نے انکو یہ حکم دیا۔ اگر یہ طاقت کہنی تھی تو اسکو ہندوستان فتح کر کے کیا نفع ملتا۔ اور اگر یہ طاقت، حکومت انگلینڈ، تھی تو اسکی غرض

کیا تھی اور وہ کیونکر پارلیمنٹ کے روبرو اپنے اس فعل کو جائز ثابت کر سکتی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہم جنگ جو قوم رہے ہوں لیکن وہ خاص جنگیں جو ہم نے طرین زیادہ تر مدافعتیہ تھیں۔ فتح، غریبان نے کبھی اپنی طرف ہماری تو جسہ نہیں کھینچی۔ تو آخر ہمارے دل میں کیا تھا!

سلطنت انگلینڈ کو یقیناً اس تسبیح سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوا۔ کیونکہ اگر ایک طرف اس کے میزانیہ پر اس فتح کے اخراجات کا بار نہیں پڑا تو دوسری طرف کسی قسم کے خراج کی وجہ سے اس کے میزانیہ ہلکا بھی نہیں ہوا۔ اگر ہم سوال کریں کہ اس سے کس کو فائدہ ہوا تو اس کا نتیجہ جواب یہی ہوگا ”انگریزی تجارت کو“ اس ملک سے ہماری بیرونی تجارت بہت بڑے پیمانہ پر ہے اور جب تک ہم ہندوستان کے مالک ہیں یہ تجارت قائم رہے گی۔ اس معنی میں ہلکا ایک عظیم مادی فائدہ حاصل ہے جو اس زمانہ میں جب غیر ملکی حکومت مستحکم حفاظت کی محتاج ہے بسا غنیمت ہے۔ تو کیا یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ ابتدا سے آخر تک تجارت ہی ہمارا سطح نظر تھا۔

یہ قول بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے اور اس وقت تو اور بھی معقول معلوم ہوتا ہے جب ہم کہتے ہیں کہ ہماری سلطنت کی ابتدا تجارت سے ہوئی۔ پہلے پہل ہم نے صرف اپنی تجارتی کوٹھیوں کی حفاظت میں ہتھیار اٹھایا۔ جو صورت ہماری اور فرانس کی نوآبادیاتی جنگ کی تھی وہی صورت ہندوستانی لڑائیوں کی بھی تھی کیونکہ یہ بھی اسی زمانہ میں ہوئیں اور انکی نوعیت بھی وہی تھی۔ ان لڑائیوں کے اسباب وہی تھے جن پر میں نے بہت اصرار کیا ہے یعنی پندرہویں صدی میں جو جدید ممالک دریافت ہوئے انکی دولت کی خاطر مغربی سلطنتوں کی باہمی رقابت۔ امریکہ کی طرح ہندوستان میں بھی ہماری تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ دونوں ممالک میں ہیں ایک ہی حریف یعنی فرانس سے مقابلہ پڑا۔ دونوں ممالک میں انگریز اور فرانسیسی سوداگر اپنے اپنے تجارتی مرکز سے ایک دوسرے کی مخالفت کر رہے تھے۔ امریکہ میں ہمارے پاس نیو انگلینڈ اور درجینا تھے تو ان کے پاس اکادیمی (Hudson) اور کناڈا۔ ٹھیک اسی طرح ہندوستان میں مدراس، کلکتہ اور بمبئی ہمارے پاس تھے تو ان کے مقابلہ میں پانڈیچری، چندرنگر اور ماہی فرانسیسیوں کے پاس۔

۱۷۴۰ء اور ۱۷۵۷ء کے مابین دونوں ملکوں میں ایک ہی ساتھ خطرہ رونما ہوا۔ اس وقت دونوں سلطنتوں کے درمیان جو ناقص اور سطحی معاہدہ تھا وہ ٹوٹ گیا تھا اور ایک سلطنت دوسری سلطنت پر غلبہ حاصل کرینے کے جدوجہد کر رہی تھی۔ لیکن دونوں جگہ انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی۔ ہندوستان میں فرانسیسیوں پر غلبہ پاتے ہی ہم نے ہندوؤں پر غلبہ حاصل کرنا شروع کیا۔ یہ واقعہ دوسرے واقعہ سے ملکر اس اصول کی طرف ہماری رہبری کرتا ہے کہ ہماری سلطنت کی ترقی میں شروع سے آخر تک جذبہ تجارت کا فرما رہا ہے۔ جب ہلکے ساحلی مقامات میں استحکام حاصل ہو گیا اور دیسی طاقتوں اور فرانسیسیوں کی رقابت کی طرف سے اطمینان خاطر نصیب ہو گیا تو ہم نے اندرون ملک میں اپنی تجارت کو وسعت دینے کا منصوبہ باندھا۔ ہلکوریاست میسور اور مرہٹوں سے مقابلہ پڑا جو پہلے تو ہمارے ساتھ تجارت کرنے پر رضا مند نہ تھے لیکن

تجارت کی حرص میں ہنرے قوت کا استعمال کیا ان پرانی فوجوں سے یلغار کر دی، اُنکے کمرگ قانون کو تباہ و برباد کر کے اُنکے علاقوں میں اپنا مال تجارت لیکر سیلاب کی طرح پھیل گئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہماری تجارت کو ترقی ہوتی گئی۔ پہلے تو یہ بالکل بے حقیقت بات تھی لیکن بعد میں اسکو بہت وسعت حاصل ہو گئی۔ انجام کار جب ہم نے تمام بڑی دیسی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا۔ جب نہ کوئی محل شہنشاہ رہ گیا نہ سلطان میسور، نہ مرہٹوں کا پیشوا باقی رہا نہ اودھ کے نواب اور نہ سکھوں کا مہاراجہ یا خالصہ، اسوقت تمام رکاوٹیں رفع ہو گئیں اور ہماری تجارت ناقابل قیاس پیمانہ پر پہنچ گئی لیکن اگر نظر تعمق غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ واقعات اس اصول پر صادق نہیں آتے۔ یہ سچ ہے کہ ہماری سلطنت کی ابتدا تجارت سے ہوئی اور یہ بھی صحیح ہے کہ تھوڑے دنوں سے اسکو بید فروغ ہے، لیکن تاریخ میں ضرور یہ نہیں ہے کہ واقعات کا سلسلہ ہمیشہ خط مستقیم کی طرح سید ہا چلا جائے حقیقت یہ ہے کہ اگر تجارت کی لہر ناقابل دفع ہوتی اور تمام مشکلات پر غالب آنے کیلئے ہر طرح کٹیا رہوتی تو اسکو ہندوستان میں جنگ کی نوبت نہیں آتی۔ کیونکہ وہاں پر حقیقی رکاوٹیں مفقود تھیں۔ انگریزی تجارت کو دیسی بادشاہوں کی رقابت کا خطرہ نہیں تھا بلکہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی کی رقابت کا اندیشہ تھا۔ لہذا تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملکی فتوحات کی ترقی کو کوئی علاقہ نہیں۔

برخلاف اسکے ہماری تجارت باوصف تمام فتوحات کے ساتھ ہم تک بالکل بے حقیقت تھی۔ ۱۸۳۳ء کے فوراً بعد ہی اس میں سرعت کیساتھ ترقی شروع ہوئی۔ یہ دونوں تاریخیں تجارت کی ترقی کے حقیقی اسباب کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت کی ترقی فتوحات کی ترقی سے قطعی بے نیاز ہے۔ کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب پالمنٹ کا وہ قانون نافذ ہوا جسکی بدولت کمپنی اپنی اجارہ داری سے محروم ہو گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ ہندوستان کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے فتح کیا تھا لیکن اُنکے ساتھ اعلیٰ پیمانہ پر تجارت اُس وقت وجود میں آئی جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا وجود معدوم ہو گیا۔ ہندوستان میں ہماری فتح ایک اجارہ دار کمپنی کی مرہون احسان ہے لیکن وہاں کی تجارت کو اسوقت فروغ حاصل ہوا جب خود کمپنی نیست و نابود ہو گئی

اس امر کو زیادہ واضح کرنے کے لئے آسان ہوگا اگر ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ کے ایسے عنوانات بیان کر دیں جن سے اسکی ترقی کے خاص مدایج ظاہر ہو جائیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۰ء میں یعنی ملکہ الزبتھ کے آخر عہد میں وجود میں آئی۔ جس نقطہ نظر سے ہم توسیع انگلستان کے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اس لحاظ سے عین وقت پر اس کمپنی کا وجود ہونا نہ بعد۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگلینڈ نے اپنی موجودہ بحری روش قریب قریب اسپینش آرڈر کے وقت اختیار کی۔ اُسی وقت پہلے پہل اسکے بحری سوراؤن کی قوم نمودار ہوئی اور اُسی وقت اسنے امریکہ میں نوآبادی قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمکے ہندوستان میں اپنے ابتدائی قیام کے لئے اُسی زمانہ کی طرف نظر کرنا چاہئے۔ واقعی ٹھیک اُسی وقت ہندوستان میں ہمارے قیام کی ابتدا ہوئی کیونکہ اسپین کے بحری بیڑہ (Armada) کی شکست کے ۱۲ سال بعد

ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی

یہ کمپنی محض تجارت کی غرض سے قائم ہوئی اور ایک سو اڑتالیس سال تک صرف تجارت پر اسکی توجہ مرکوز رہی۔ اس زمانہ میں اسکی تاریخ میں کئی اہم واقعات ہوئے لیکن ان میں کوئی اتنا اہم نہیں جو ہماری توجہ کا مستحق ہو۔ ۱۷۰۷ء میں دکن میں ہرے پیمانہ پر فسادات رونما ہوئے جنھوں نے کمپنی کو مجبور کیا کہ وہ بھی اعلیٰ پیمانہ پر حکومت اور جنگ کی خدمت میں انجام دے۔ اس کے بعد کمپنی کا دوسرا قابل یاد کار دور شروع ہوا جو مدت میں دو راول کے برابر تھا۔ یہ دور ۱۱ سال کی مدت پر حاوی ہے اور ۱۷۵۷ء میں کمپنی کی تیسرے پر ختم ہوا۔ یہی وہ دوسرا دور ہے جس سے ہکوا اس وقت بحث ہے ارتقاء کے مختلف مدارج سمجھنے کے لئے ہم اس دور کو کئی حصوں میں تقسیم کرینگے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس دور کے بیشتر واقعات میں ایسا تسلسل ہے جو تاریخ میں بہت کم پایا جاتا ہے اور اس سے یادداشت میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کمپنی اپنے عہد نامہ کی تجدید کے لئے پارلیمنٹ کی محتاج تھی۔ چونکہ ۱۷۰۷ء سے کمپنی کے حالات نے عجیب روش اختیار کر لی تھی اسلئے پارلیمنٹ کے لئے بالکل قدرتی تھا کہ وہ عہد نامہ کی تجدید ایک مدت معینہ کے لئے کرے اور پھر اسکے اختتام پر کمپنی کے حالات پر غور کر کے اسکے انتظام میں ضروری تبدیلیاں پیدا کرنے اس طرح کمپنی میں تھوڑے تھوڑے مساوی المدت وقفہ کے بعد تبدیلیاں ہونے لگیں۔ ہر وقفہ کی مدت ۲ سال ہوتی تھی۔ اسکا آغاز ۱۷۰۳ء میں لارڈ نارٹھ کلف کے ریگولٹنگ ایکٹ سے ہوا۔ اسکے بعد چار تاریخیں ایسی ہیں جو کمپنی کی تاریخ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں یعنی ۱۷۰۳ء، ۱۷۱۳ء، ۱۷۳۳ء، ۱۷۵۳ء

یہ تاریخیں ہماری توقع کے مطابق اہم ہیں اور کمپنی کی تاریخ کے لئے ان سے زیادہ سہل ڈھانچہ ہونا مشکل ہے۔ پہلی تاریخ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر ۱۷۰۳ء میں اس تحریک کی بنیاد پڑی جو آگے چلکر برٹش انڈیا کے وجود کا باعث ہوئی تو ۱۷۰۳ء اس زمانہ کی یاد تازہ کرتا ہے جب خود برٹش انڈیا عالم ہستی میں آگئی۔ اسی سال سے گورنر جنرل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اگرچہ ایک عرصہ تک یہ عہد جیسے گورنر جنرل ہندوستان کے گورنر جنرل بنگال کہلاتا تھا۔ اسی زمانہ میں کلکتہ میں عدالت العالیہ قائم ہوئی۔ اسی وقت ہمارے ہندوستانی معاملات کو بے انتہا خطرون کا سامنا پڑا اور کمپنی میں جو بدعنوانیاں تھیں انکا سدباب بھی اسی وقت ہوا کیونکہ کمپنی کے حصہ داران یا مالکان کو اسکے معاملات میں اب کوئی اختیار باقی نہیں رہ گیا تھا۔

دوسرے دور کی تاریخ ۱۷۱۳ء ہے۔ یہ تجدید کم اہم ہے البتہ اس وقت جو بحثیں ہوئیں وہ ضرور دلچسپ تھیں کیونکہ انھیں اینگلو انڈین طبقہ کی ابتدائی زندگی کا وہ نقشہ نظر آتا ہے جب اس میں ہندویت سرایت کر گئی تھی، جب ہندوستان کو جنت کی طرح پاک رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی اور کسی یورپین خصوصاً مشنری والوں کو اسکے اندر گھسنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن ۱۷۱۳ء کی تاریخ بنفسے اتنی ہی اہم ہے جتنی اور تاریخیں کیونکہ

اس سہ ماہیہ کی تجدید ہی نہیں ہوئی بلکہ اسی سال بنگال کا مشہور ہندو بست دوامی بھی ہوا جو دنیا کی تاریخ میں نہایت قابل یادگار واقعہ ہے

دوسری تاریخ تجدید ۱۸۱۳ء ہے جب انٹی سال کا بڑھا تا توان دارن ہنگر ہندوستان سے پیش لیکر دارالعلوم میں شہادت کے لئے طلب ہوا۔ یہ تاریخ اس زمانہ کو بتلاتی ہے جب کمپنی کی اجارہ داری میں انحطاط شروع ہوا اور برہمنیت کا دور آخر ہوا۔ جب انگلینڈ نے اپنی تہذیب یا بالفاظ دیگر عیسائیت اور مغربی علوم کی تبلیغ ہندوستان میں شروع کی

۱۸۱۳ء میں اجارہ داری ختم ہو گئی۔ اس وقت کمپنی کا وجود باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد کمپنی کی حیثیت محض ایک کارآمد ادارہ سے زیادہ نہیں رہی، کارآمد اس لئے کہ اسی کی روایات اور تجربات پر ہندوستان پر انگلینڈ حکومت کرتا تھا۔ اس وقت سے ہماری ہندوستانی گورنمنٹ باضابطہ طریقہ پر وضع قوانین کی رحمت برداشت کرنے لگی

پھر ۱۸۵۷ء میں مقابلہ کے ذریعہ تقرری کا قاعدہ نافذ ہوا۔ اس طرح وہ پرانا مسئلہ جس نے ۱۸۵۷ء میں انگلینڈ کی بنیاد متزلزل کر دی تھی اور جس کو بڑے سے بڑا مدبر بھی چھوٹے ہوئے سمجھتا تھا حل ہو گیا۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان کی سیادت کس کو ملنی چاہئے اور کیونکر بغیر انگلینڈ کے دستور اساسی پر دباؤ ڈالے ہوئے اس مسئلہ کی گتھی سلجھائی جاسکتی ہے۔

لیکن اس جگہ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کی یہ رفتار یکساں عرصہ تک قائم نہیں رہتی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے اس دور تجدید پر آخری مہر لگا دی۔ اور ۱۸۵۷ء جو ریگولٹنگ ایکٹ کی صد سالہ سالگرہ ہے ہندوستان کی تاریخ میں کوئی اہم تاریخ نہیں ہے۔

اس خاکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۳ء وہ سن ہے جس میں اجارہ داری میں بہت کمی واقع ہوئی اور ۱۸۵۷ء وہ سال ہے جس میں قطعی طور سے اسکو تباہ کر دیا گیا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے ساتھ ہماری تجارت کو اس قدر بے حقیقت لکھا ہے اپنے سامنے صرف ۱۸۱۳ء تک کے اعداد و شمار رکھتا ہے۔ وہ اعداد و شمار جن سے موجودہ تجارت کی ترقی کا اندازہ لگتا ہے ۱۸۱۳ء کے زمانہ مانجہ سے متعلق ہیں، خصوصاً ۱۸۳۳ء کے مابعد زمانہ سے۔ دوسرے نقطوں میں جب تک ہندوستان اُن لوگوں کے قبضہ میں رہا جس کا مطلع نظر تجارت تھا، اسکی تجارت بالکل حقیر تھی جب سے ہندوستان پر ہندوستان کی خاطر حکومت ہونے لگی اور تجارتی اغراض سے بے اعتنائی برتی جانے لگی تو پھر اسکی تجارت کو فروغ ہوا، اور بے حساب فروغ۔ بظاہر حقیقت غلط معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کیا ہمیں یاد نہیں ہے کہ تجارت سے بے اعتنا ہو کر تینے اجارہ داری تباہ کر دی۔ لیکن اگر ایک تجارتی کمپنی باوجودیکہ اسکی غرض و غایت تجارت ہی ہوا اپنے مدعا میں ناکام رہے اور اجارہ داری کی قیود کے دور ہوتے ہی اسکی تجارت اعلیٰ پیمانہ پر پورے ہوئے تو اس میں کوئی

تعب کی بات نہیں۔

کیا ہم نہیں دیکھتے کہ ہمارا تجارتی فروغ قطعی اس زمانہ سے متعلق نہیں ہے جب ہندوستان میں ہمارے قبضہ کی ابتدا ہوئی۔

ہندوستان میں چار بڑے حکمران گذرے ہیں جنکو جرمنی کی اصطلاح میں ”سلطنت کا ترقی دینے والا“ کہا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ لارڈ کلايو۔ بانی سلطنت، لارڈ ویلزلی۔ لارڈ ہسٹنگز۔ لارڈ ڈالہوزی پچھلے حکمرانوں سے لیکر مدراس تک مشرقی ساحل پر متصرف کر دیا، دوسرے اور تیسرے نے مرہٹوں کی قوت توڑ کر ہکو وسط ہند اور جزیرہ نما کے مغربی حصہ پر تسلط کر دیا اور چوتھے نے ان فتوحات کو مستحکم کرنے کے علاوہ ہمارے قبضہ میں شمالی مغربی حصہ دیکر ہماری سرحد کو انڈس تک پہنچا دیا۔ ان فتوحات کے درمیان طویل وقفہ ہوا۔ چنانچہ یہ فتوحات کئی الگ الگ مجموعوں میں پڑتی ہیں۔ ایک زمانہ فتوحات کا ۱۷۵۷ء اور ۱۷۶۱ء کے درمیان تھا۔ اسکو ہم لارڈ کلايو کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ دوسرا دور ۱۷۶۱ء سے شروع ہوا اور تقریباً ۱۸۱۸ء تک رہا، اگرچہ اس زمانہ کا بیشتر حصہ خالی گذرا۔ اس دور کو ویلزلی اور ہسٹنگز کے نام سے معنون کر سکتے ہیں۔ تیسرا دور جنگ کا تھا اور یہ ۱۸۱۸ء کے درمیان رہا۔ لیکن اس کا ابتدائی حصہ ناموافق گذرا البتہ دوسرے حصہ میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن ان فتوحات کا ثمرہ لارڈ ڈالہوزی کی قسمت میں لکھا تھا

اب ان ملکیتی اور تجارتی ترقیوں میں قطعی مطابقت زمانہ نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ ابھی ہم نے لکھا ہے کہ ۱۸۱۸ء تک ہندوستان کی تجارت کس قدر غیر اہم تھی حالانکہ یہ زمانہ ٹھیک ویلزلی کے احاطہ عظیم کے بعد کا ہے۔ برخلاف اسکے ۱۸۳۰ء میں تجارت کو نہ معلوم کہاں کے پر تک گئے حالانکہ تاریخ میں یہ زمانہ نہایت پر امن شمار کیا جاتا ہے۔ عذر کے قریب احاق کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اسکے بعد سے جو تھائی صدی کا زمانہ گذرا اس درمیان میں کوئی فتوحات نہیں ہوئیں لیکن یہ زمانہ تجارت کی انتہائی تیز رفتاری کا زمانہ تھا۔

چنانچہ جس طرح یہ دعوی باطل ثابت ہوتا ہے کہ یہ سلطنت فوجی پیش قدمی کے ناقابت اندیشانہ جوش کا نتیجہ ہے اسی طرح یہ خیال بھی باطل ہے کہ یہ تجارت کے مجنونانہ انہماک کی منت پذیر ہے۔

قیام سلطنت کی جانب ہمارا پہلا قدم اپنی کوٹھیوں کی حفاظت میں اٹھا۔ احاطہ مدراس ہماری اسی کوشش کا نتیجہ ہے جو پہلے قلعہ سنیت جابج اور سنیت ڈیوڈ کی مدافعت میں کی تھی۔ اسی طرح احاطہ بنگال فورٹ ولیم کی محافظت کے سلسلہ میں اٹھا آیا جب پہلے بنگال کے سلطان نواب سراج الدولہ کو کال کوٹھری کے مظالم کی سزا دی تھی۔

ہاں تک اسباب واضح ہیں۔ اسکے بعد جو زمانہ آیا یعنی برطانوی ہند کا وہ انقلابی دور جس میں رشوت ستانی اور بے ایمانی کی گرم بازاری تھی اسلئے طور سے سخت گیری کا دور تھا۔ وارن ہسٹنگز کے خلاف جو اس قدر خمد و کارروائی

بنارس، اودھ اور دہلیکھنڈ میں ہوئیں وہ سب رشوت ستانی کے سلسلہ میں تھیں۔ اگر برطانوی ہند کی مابعد کی تاریخ بھی اسی قسم کی ہوتی تو ہم بلاخوف کہہ سکتے تھے کہ یہ سلطنت بھی سپے نیولا اور پیرو کی ہسپانوی سلطنت کی طرح جلب مغت کے مجنونانہ جوش کی بدولت قائم ہوئی ہے

لیکن کارڈ کا رنوالس کے عہد سے (۱۸۵۷ء) اس روش میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ کچھ تو اپنے اعلیٰ کیریکٹر کے نمونہ اور کچھ دانشمندانہ اصلاح سے اُسے ملازمت کو بے ایمانی سے کلیڈھ پاک کر دیا۔ اُسے کمپنی کے ملازمین کی تنخواہیں اتنی معقول کر دیں کہ انھیں رشوت ستانی کا کوئی حیلہ باقی نہیں رہا۔ اس وقت سے ملازمت معزز شمار ہونے لگی۔ اس تبدیلی سے قدرتی طور پر ہکو توقع ہونی چاہئے تھی کہ اگر طبع زرہی فتوحات کی محرک تھی، تو کمپنی کی زیادتی موقوف ہو جائیگی۔ کیونکہ اس وقت سے نہ صرف کمپنی کے بجٹ اپنے کیریکٹر کو کھونے لگے بلکہ اُنکے لئے صریح دغا بانی اور بے ایمانی کیساتھ فتوحات حاصل کرنا قطعی ناممکن ہو گیا۔ اس لئے کہ ۱۸۵۷ء سے جب ۱۹۱۷ء نے حکمت و عملی جاری کی ایسا کرنا اُسی وقت ممکن تھا جب انگریزی وزارت کو بھی کمپنی اپنا شریک بنا لیتی حالانکہ انگریزی وزارت سے بلند حوصلگی کا جرم، سرزد ہونا تو ممکن تھا لیکن اس کی ذات سے یہ امید رکھنا کہ وہ ایک تجارتی کمپنی کے کمینہ جراثیم سے اغماض کر گی قطعی ناممکن تھا

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انڈیا بل کے زمانہ سے ہندوستانی معاملات کا اعلیٰ انتظام کمپنی کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس وقت سے وہ ہم جو تجارتی اغراض کے ماتحت شروع ہوئی تھی ایسے لوگوں کے انتظام میں آگئی جنکو تجارت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس وقت سے ہندوستان کے خاص خاص مسائل کا انصرام دو انگریز مدبروں کے ہاتھ میں آ گیا ایک صدر بورڈ آف کنٹرول اور دوسرے گورنر جنرل۔ اور جب تک کمپنی کا قیام رہا ان دونوں میں ممتاز حیثیت گورنر جنرل ہی کی تھی۔ اس انتظام کے ماتحت ہندوستان کی بیشتر فتوحات حاصل ہوئیں اور یہ یقینی ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے ہندوستانی معاملات میں تجارت کی روح کا رفرمان نہیں تھی

۱۸۵۷ء سے جب لارڈ کا رنوالس گورنر جنرل ہوا ہندوستان کی حکمت عملی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس نے پہلے پہل مداخلت اور احاق، کا اصول مرتب کیا۔ اس اصول سے لارڈ ہسٹنگز نے گورنر جنرل ہونے سے قبل تو اختلاف کیا تھا لیکن بعد کو اسی پر عمل کیا۔ سب سے آخر میں اس اصول پر لارڈ ڈلہوزی نے نہایت سختی سے عمل کیا۔ لارڈ ڈلہوزی کمپنی کا سب سے آخری گورنر جنرل تھا

یہ تھا وہ اصول جسکے ماتحت ہندوستان فتح ہوا۔ اس لکچر میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں اس اصول کا تجزیہ کروں۔ میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ یہ تجارت کی ترقی کا حافی نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ کمپنی نے ہمیشہ اس کی حمایت سے اختلاف کیا۔ کمپنی نے ویلنری کی مخالفت اور ہسٹنگز کو ملامت کی۔ اگر ڈائرکٹر ان کمپنی لارڈ ہسٹنگز کے

ساتھ بہت ملامت سے پیش آتے تھے تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس زمانہ میں انکی حیثیت عملاً ایک تجارتی کمپنی کے نمائندہ کی نہیں رہ گئی تھی۔ بعض اوقات اس اصول پر نہایت سختی سے عمل کیا گیا تا مگر لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں لارڈ ڈلہوزی فریڈرک اعظم کے نمونہ کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے اُسکے افعال کو حق بجانب کہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سنہ ۱۷۵۹ء یا تقسیم پولینڈ کو۔ لیکن اگر یہ افعال جرم ہیں تو اسی قسم کے جیسے کہ فریڈرک اعظم کے۔ یعنی یہ جرم عالی حوصلگی کے تھے نہیں خود غرضی کا مطلق شاہیہ نہیں تھا۔ نہ تو لارڈ ڈلہوزی اور نہ دارن ہسٹنگز کے بعد کوئی دوسرا گورنر جنرل کمینہ سخت گیری کا مجرم قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہماری سلطنت جسکی ابتدا اور اصل تجارت سے ہوئی نہ تو تاجروں کے دماغ کی پیداوار ہے اور نہ تجارتی اغراض کے ماتحت وجود میں آئی اگرچہ اس وقت ہماری تجارت بڑے پیمانہ پر بپو بخ گئی ہے۔

عبد القیوم رسا

ضرورت ہی

ایک سند یافتہ آیور ویدک ڈاکٹر اور ایک حکیم کی ناگپور کے آیور ویدک ویونانی شفا خانہ کیلئے کسی سرکاری مستند کالج کے سند یافتہ اور تجربہ کار کو ترجیح دیجائے گی ماہانہ مشاہرہ ۱۵۰ روپے سے شروع ہو کر دو روپیہ سالانہ کی ترقی سے نفعہ تک ہو گا پیر الویٹ پریکٹس کی بھی اجازت ہوگی لیکن ان شرائط کے ساتھ جو ملازم گورنمنٹ سب اسسٹنٹ سرجن پر عاید ہوتی ہیں۔ درخواست کے ساتھ نقول سنا دیجی ہونا چاہئے اور اس امر کی صراحت کہ کن تعلیم کا ہون میں در کس کس فن رجسٹرڈ ہیں تعلیم حاصل کی ہے۔ عمر کا بھی اظہار ہونا چاہئے اور چارچلن کے خوب کی تصدیق بھی۔ درخواستیں حسب ذیل پتہ سے ۲۸ مارچ ۱۹۳۳ء تک جانا چاہئے۔

اس۔ پی۔ پی۔ چوہان
سکرٹری
میونسپل کمیٹی ناگپور

باب الاستفسار

غالب و بیدل

(جناب سید زوار حسین صاحب گویا)
اس سے قبل آپ کی بعض تحریروں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ غالب کو بیدل کا متبع سمجھتے ہیں حالانکہ دونوں کے رنگ کلام میں بہت فرق ہے۔ کیا آپ اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے،

(نگار) جہاں تک میرا حفظہ یاوری کرتا ہے، مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے غالب کو بیدل کا مقلد یا متبع لکھا ہو، لیکن یہ ضرور میں نے کسی جگہ ظاہر کیا ہے کہ اول اول غالب نے ریختہ میں بیدل ہی کے تتبع کی کوشش کی، لیکن جیل سمین کا میا بی نہ ہوئی تو مومن کا رنگ اختیار کر کے بعض خصوصیات کے لحاظ سے ایک مستقل رنگ کا مالک ہو گیا۔
میں غالب کو بیدل کا متبع یا مقلد اس وقت کہتا جب وہ اس رنگ میں کامیاب ہو جاتا۔ ناکامی کی حالت میں کیونکر ایسا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہاں، یہ ضرور کہوں گا کہ اس نے اس کی کوشش ضرور کی اور آخر کار منزل کی دشواریوں کو دیکھ کر اپنا جادہ مقصود ہی بدل دیا۔

اس سلسلہ بحث میں صرف دو سوال پیدا ہوتے ہیں :-
(۱) کیا غالب نے بیدل کا متبع کیا اور کیوں - (۲) کیا اس سعی میں وہ ناکام رہا اور کن اسباب کی بنا پر۔
پہلے سوال کا اول جزو اپنے ثبوت کے لئے زیادہ کاوش کا محتاج نہیں خود غالب کا بیان کافی ہے ملاحظہ ہو :-
طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خان قیامت ہے

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ نازہ ڈالی ہے مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب ساز پر رشتہ پئے نغمہ بیدل با ندھا
دوسرے شعر میں غالب علانیہ اعتراف کرتا ہے کہ مجھے بیدل کی جدت طرازیان پسند ہیں جسے وہ بیدل کے مخصوص انداز میں، رنگ بہار ایجادی سے بغیر کرتا ہے، تیسرے شعر میں وہ زیادہ قوت کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ میرا تار نفس

نغمہ بیدل کے لئے وقف ہے۔ پہلا شعر معلوم ہوتا ہے بہت بعد کا ہے جب خود اس نے محسوس کر لیا کہ بیدل کا متبع ممکن نہیں اسی کے ساتھ جب اس کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو کثرت سے اس کی شہادتیں ملتی ہیں کہ غالب نے ریختہ میں کمان کمان اور کس کس طرح ”بیدل سرائی“ کی ہے۔ نغمہ حمید یہ کہ دیکھنے سے تو ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ غالب کے حذف شدہ کلام میں غنہ غالب اس حصہ کا ہے جس میں بیدل کا رنگ پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے لیکن اسکے معروف و متداول دیوان میں بھی بہت سے اشعار اور متعدد ترکیبیں اس ثبوت میں پیش ہو سکتی ہیں۔

نغمہ حمید یہ کہ حسب ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:-

قضاے خندہ گل تنگ و ذوق عیش بے پروا فراغت گاہ آغوش و ذراع دل پسند آیا
ہوئی جس کو بہار فرصت ہستی سے آگاہی برنگ لالہ جام بادہ بر محل پسند آیا
سواد چشم بیل انتخاب نقطہ آرائی خرام ناز بے پروائی قاتل پسند آیا
یہ ساری غزل غالب نے قصداً بیدل کے رنگ میں لکھی تھی جس کا اعتراف وہ خود قطع میں کرتا ہے:-
اسد ہر جاسخن نے طرح بارغ تازہ ڈالی ہو مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

نہ بھولا اضطراب دم شمار می تظار اپنا کہ آخر شیشہ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

جاندا دکان کا حوصلہ فرصت گداز ہے یا نہ عرصہ پیدل بسمل نہیں رہا

ہوں قطرہ زن بودی حسرت شبانہ روز جز تار اشک جاوہ منزل نہیں رہا

شوق سامان فضولی ہے وگرنہ غالب ہم میں سرمایہ ایجاد تمنا کب تھا

موقوف کیجئے یہ تکلف نگار یا نہ ہوتا ہے ورنہ شعلہ رنگ حنا بلند

غور و ضبط وقت نزع ٹوٹا بقرار نہ نیاز بال افشانی ہوا صبر و شکیب آخر

پیائے وسعت کدہ شوق ہوں لے شک محفل سے مگر شمع کو دل تنگ نکالوں

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج مین عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں
 الغرض اس قسم کے اشعار کثرت سے نسخہ حمید یہ مین پائے جلتے ہیں جو بیدل کے متبعین لکھے گئے ہیں۔ معروف
 دیوان کے بھی بہت سے اشعار اسی رنگ کے ہیں۔ جن سے ہر شخص واقف ہے تحریر و انتخاب کی ضرورت نہیں۔
 اب سوال یہ ہے کہ کیوں غالب نے بیدل کا متبع کیا اور کیوں اس مین وہ ناکام رہا۔ اور اس کے ساتھ یہ امر بھی
 قابل غور ہے کہ فارسی مین کیوں اس نے بیدل کا رنگ اختیار نہیں کیا جس مین اس کے لئے زیادہ آسانی تھی۔
 اس مین شک نہیں کہ غالب فطرت کی طرف سے فارسی کا نہایت پاکیزہ ذوق لیکر آیا تھا اور اسی کے ساتھ
 خوش بختی سے اُسے استاد بھی ایک ایرانی ماہر زبان مل گیا اس لئے ظاہر ہے کہ اس نے پہلے فارسی ہی زبان کی شاعری کی
 طرف توجہ کی ہوگی اور اساتذہ ایران ہی کے کلام کو اپنے سامنے رکھا ہوگا۔ پھر چونکہ ذوق مین شروع سے شوخی پائی جاتی تھی اور
 عقوان شباب مین زندانہ جوش و خروش کا ہونا فطری امر ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ ابتداءً اُسے بیدل کی طرف توجہ ہوئی
 جو نہ ایرانی شاعر تھا اور نہ اُس سطح کا جو عام طور پر غزلگوئی کے لئے مخصوص ہے۔ بعد کو جب غالب سن و قوت کو پہنچا اور
 زمانہ کے گرم و سرد تجربات نے اُسے روحانیت کی طرف مائل کیا تو یہ وہ وقت تھا جب اسکی ریختہ گوئی شروع ہو گئی تھی
 حالت یہ تھی کہ مغلیہ عہد کا چراغ بجھ رہا تھا، مصائب و آلام نے دلون مین سوز و گداز پیدا کر رکھا تھا اور طبائع متضام
 شاعری کی جانب مائل تھے۔ غالب، ہر جہد ایسی طبیعت لیکر نہ آیا تھا کہ اس ماحول سے صحیح معنی مین جذبات استسلام
 اس کے اندر پیدا ہوتے، لیکن کچھ نہ کچھ اثر اُسپر بھی ہوا اور دل مین ہلکی سی وہ کیفیت پیدا ہوئی جس کا پایا جانا کلام
 بیدل سے لطف اٹھانے کے لئے ناگزیر ہے۔ ریختہ گوئی کا زور تھا، غالب بھی محافل مشاعرہ کی گرم بازاری مین حصہ
 لے رہا تھا۔ اپنے فارسی کلام سے اپنی ریختہ گوئی کو میسر بنانا چاہتا تھا، بلندی ذوق حدت طرازی، میر و درد کے رنگ
 کی طرف مائل نہ ہونے دیتی تھی اس لئے وہ مجبور ہو گیا کہ بیدل ہی کو سامنے رکھ کر ریختہ گوئی کے نقوش ساز کرے کیونکہ وہ
 اس رنگ مین فارسی ترکیبیں بھی اخلاق پسندی کی حد تک استعمال کر سکتا تھا جو اس کا طبیعتی رجحان تھا اور اپنی تخیل مین
 بھی ندرت و ابداع کی صورت مین پیدا کر سکتا تھا جو اس کا ذہنی میلان تھا۔

پھر اب سوال یہ رہتا ہے کہ غالب کی ناکامی کے اسباب کیا تھے۔ اسپر غور کرنے سے قبل ضروری ہے کہ
 کلام بیدل کی خصوصیات کو مختصر اظہار کر دیا جائے

اکثر تذکرہ نویسوں نے جن مین مولانا شبلی مرحوم بھی شامل ہیں، بیدل کے سمجھنے مین سخت غلطی کی ہے اور اسلئے
 اُس کے کلام پر وہ صحیح تنقید نہ کر سکے۔ اسپر سب سے بڑا الزام یہ رکھا گیا ہے کہ اس کے کلام مین فارسییت نہ تھی اور دور
 از کار استعارات و تشبیہات نے اس کے کلام کے اخلاق کو اہمال کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ پہلا الزام اگر وہ واقعی
 بیدل کے لئے کوئی الزام ہو سکتا ہے، یقیناً ایک حد تک صحیح ہے، کیونکہ محض لطف زبان نہ اس کا مقصود تھا اور نہ

زبان کی پابندی کے ساتھ وہ اپنے خیالات کو ادا کر سکتا تھا، وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنا چاہتا تھا اور جب زبان کی تمام معمولی و متداول ترکیبیں ناکافی ثابت ہوتی تھیں تو بالکل الہامی و وجدانی طور پر از خود نئی نئی ترکیبیں اس کے ذہن سے پیدا ہوتی تھیں اور اس طرح گویا وہ اپنی ندرت تخیل کے ساتھ ساتھ ایک نئی زبان بھی پیدا کر رہا تھا، بیدل کو محض شاعر کہنا اور شاعر سمجھ کر اس کے کلام پر تنقید کرنا درست نہیں، وہ شاعر سے زیادہ بلند چیز خندید تھا بلکہ اس سے بھی ارفع ایک خلاق سخن تھا، ایک پیام رسان قدرت تھا، حسن و عشق کی معمولی شاعری اس کے ذوق سے بہت فرد و ترجیز تھی اور اُس کا ہر لفظ ایک ایسا نغمہ لاہوتی تھا جس کی مثال سوائے الہامی کتابوں کے کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ پھر ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو صرف سعدی، نظامی، حافظ، فردوسی، عارفی، نظیر سی، کی سطح سے بیدل کا مطالعہ کریں گے وہ یقیناً کوئی لطف اس کے کلام میں نہ پائیں گے اور جنھوں نے وہ مخصوص ذہنیت فطرت کی طرف سے نہیں پائی ہے، جو بیدل کے حقائق و معارف کو سمجھ سکے، وہ اگر اس کے کلام کو مغلن مہمل اور لغو نہ قرار دیں تو تعجب ہے

بیدل اپنے بعد لاکھوں شعر اور سیکڑوں صفحات نشر کے چھوڑ گیا، لیکن آپ باوجود سعی و کوشش اس کا ایک مصرعہ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہیں دکھا سکتے جو اس کے حقیقی رنگ، اس کے صمیمی پیام سے علیحدہ ہو، اس کی شاعری، اس کی انشاء یکسر وقف تھی صرف اس ایک جذبہ کے اظہار کے لئے کفایت و مخلوق کا تعلق نہایت و لا نہایت کا سا تعلق ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ جو حقیقتاً صرف ایک پر تو ہے اُسی ایک آفتاب کبریائی کا، اپنے چیز اصلی، اپنے منبع فطری تک پہنچنے کے لئے بیتاب ہے اور یہ تمام جستجو صرف ایک حیرت ہے غیر منہا ہی، ایک حیرانی ہے ابدی، اور ایک بیکیسی و بیجاریگی ہے ناقابل علاج

کلیات بیدل کے تمام مجموعہ میں صرف رقعات ہی کا ایک حصہ ایسا ہو سکتا تھا جس میں اس امر کا امکان تھا کہ وہ اپنی نگاہ کو بلندی سے ہٹا کر پستی کی طرف مائل کرتا، لیکن اس پر آنا زبردست رنگ چڑھا ہوا تھا کہ دنیاوی معاملات و تعلقات کے اظہار میں بھی وہ اپنے حقیقی رنگ طبیعت کو نہیں چھوڑتا اور مادی تعلقات کی دنیا کو بھی وہ بالکل آسانی و شیرینی (مضمحلہ) صورت سے پیش کرتا ہے

وہ ایک شخص کو خط لکھتا ہے اور اس کی تعبیر ان الفاظ میں کرتا ہے:-

شاد باش اے دل کہ آخر عقدہ ات وای شود قطرہ مای رسد جائے کہ دریامی شود

کسی دوست کی پریشانی پر وہ اس رنگ میں اظہار خیال کرتا ہے:-

مشت خاک عشق نادانستہ صیدم کردہ است اے حیا آئم کن از ننگ صیادم پیرس

ایک جگہ نہ پہونچ سکے کا عذریون ہوتا ہے:-

نکہ گرشہ قابل روئے دوست فغان می رسانم بجائے کہ دوست
 ایک صاحب نے ایک دقیق تحفہ پیش کی تھی، اس کا شکریہ ان الفاظ میں ہوتا ہے:-
 سرکہ چشم ہوس از گل و سمن پوشیم سرے کشیم درین گودری (گدڑی) چمن پوشیم
 ہوس دے کہ تمنائے این لباس کند ہزار جان ہم آریم تا بدن پوشیم
 اگر باین ہنرست آپ درنگ عریانی چہ لازم ست کہ معیب پیرہن پوشیم
 دران بساط کہ دارنگی ست خلعت ناز مرقع سحر از بوئے یاسمن پوشیم
 کسی صحبت گزشتہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

ماہم از گلشن دیدار گلے می جیم ہر کجا آئینہ بینید مرایا دکنید
 یہ ہے رنگ بیدل کا رقصات و مکاتیب میں۔ اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نکات، چار عناصر اور
 متنویں میں اُس نے کیا کچھ نہ لکھا ہوگا اور بلندی خیال، رفعت تصور، جدت بیان، اور ندرت ادا کے کیسے کیسے
 نادر نقوش اُن میں پائے جلتے ہونگے۔ چونکہ اس مضمون میں بیدل پر تنقید کرنا مقصود نہیں ہے اس لئے میں زیادہ
 مثالیں دینے سے معذور ہوں، لیکن مذکورہ بالا چند اشعار سے بھی کافی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیدل پر کس قدر گہرا
 اثر پیغام حقیقت کا تھا اور اس کی زبان کا ہر لفظ اسی کے لئے وقف تھا
 غالب کو اپنی ذہانت، فارسیت اور شاعری پر جتنا ناز تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، مشکل ہی سے وہ کسی
 کا قابل ہوتا تھا، لیکن بیدل کی جدت طرازیوں اور معنی آفرینیوں سے وہ بھی مرعوب ہو گیا اور اس حد تک کہ آخر کار
 اس نے اس کے متبع کی کوشش شروع کر دی اور پھر خود ہی اس کے ذوق سلیم نے بتا دیا کہ کامیابی ممکن نہیں۔ غالب کی
 ناکامی کا سبب صرف یہ ہوا کہ اس نے زمین وہ نہیں پیدا کی جو بیدل کی تخیل کو بار آور کر سکتی۔ بیدل نے صرف فلسفہ نگین
 کو سلنے رکھا اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ خالق و مخلوق کا تعلق، قدرت کی بے پایاں وسعت، اس کے مظاہر
 و آثار، اپنی محدود و ناکام جستجو اور آخر میں وحدت وجود جو نتیجہ ہے اس نوع کی سعی و جستجو کا۔ غالب نے غلطی سے بیدل
 کے اس رنگ کو منطبق کرنا چاہا مادی شاعری پر مادی تغزل برادر اُن واقعات حسن و عشق پر جو اس دنیا میں،
 انسانی گوشت پوست سے متعلق رونما ہوتے ہیں، اس لئے جو کچھ اس نے لکھا وہ اُس کیفیت سے خالی رہا جو بیدل کے
 یہاں پایا جاتا ہے اور چونکہ غالب کا ذوق شعری نہایت بلند تھا اُس لئے وہ اس کی کو آخر کار خود بھی سمجھ گیا بیدل
 و غالب کے کلام کے اس فرق کو آپ ذیل کی مثال سے سمجھ سکیں گے
 غالب کا مشہور شعر ہے:-

بساط عجز میں تھا ایک لیلِ قطرہ خون بھی سوراہتا ہے باند از چکیدن سرنگون بھی

مفہوم یہ ہے کہ میری بساط عجز میں سوائے ایک دل کے کیا تھا سوائے اس کی بھی کیفیت یہ ہے کہ محض ایک قطرہ خون ہے جو ہر وقت ٹپک پڑنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اس شعر میں قلب کی صنوبری ساخت اور اس کی تعلیق وار گونی سے اس کا بہ صورت قطرہ آمادہ چکیدن رہنا ظاہر کیا ہے۔ یہ خیال غالب نے بیدل کے اس شعر سے لیا۔

آپ گریہ و خون یا قوت دایم بروئے خود چکیدن

لیکن فرق قابل غور ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ عالم خلق میں بہتر سے بہتر چیز کو لیلو مثلاً گوہر و یا قوت لیکن اسکا بھی یہ حال ہے کہ اس کا عجز اس کی حالت سے ظاہر ہے۔ دایم بروئے خود چکیدن۔ یہ پورا مصرعہ کیفیاتی تشبیہ سے متعلق ہے، غالب کے یہاں تشبیہ نظری و مادی ہے، اور دل کی تخصیص کر کے بساط عجز کے صرف ایک محدود و مخصوص منظر کو سامنے لاتا ہے، بیدل کوئی تعین نہیں کرتا بلکہ وہ تمام عالم وجود سے بحث کرتا ہے۔ غالب کو دل کی تخصیص کے ساتھ سرنگون اور یک قطرہ خون بڑھا نا پڑا، بیدل کو اپنے مقصود کی وسعت کے لحاظ سے مطلق اسکی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ غالب کو اپنا مفہوم ذہن نشین کرانے کے لئے غیر معمولی تکلف کرنا پڑا، لیکن بیدل نے اسے زیادہ سادہ و مختصر الفاظ میں اور زیادہ قوت کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ فرق کیوں پیدا ہوا، صرف اس لئے کہ بیدل کا نظریہ شاعری غالب کے نظریہ شاعری سے زیادہ بلند ہے اور اس لئے جس مضمون کو بیدل نے اس قدر بلند ہو کر بیان کیا، غالب کو اس اظہار کے لئے نیچے آنا پڑا۔ اگر کسی وقت فرصت ہوئی تو میں کلام بیدل پر تفصیلی تنقید کرتے ہوئے اس مسئلہ کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کر دینگا، فی الحال اسی پر قناعت کیجئے۔

کتابوں کی قیمت میں حیرت انگیز رعایت

جذبات بھاشا..... ۱۲	فرست الید..... عدم
شاعر کا انجام..... ۱۰	تذکرہ خندہ گل مؤلفہ مولوی عبد الباقی اسی للہ
میزان..... ۱۶	موصول..... ۱۸

لیکن اگر آپ چار روپیہ آٹھ آنے کا سنی آرڈر بھیج دیں تو ہم آپ کو یہ چاروں کتابیں ذریعہ رجسٹری بھیج دیں گے یہ رعایت صرف اخیر مارچ تک قائم رہیگی۔

مینجر نگار۔ لکھنؤ

محبت کا ایک لمحہ

شفقت کے عین شعلہ نغمہ گشتی تھا ہمارے تمام کلبوں نگین بھی نکلی تھا
نشاط اندوز ہو کر تیری کھڑائیں آئی ہند پر محبت سے کسی کے تعریف سے بھلائی
ادھر سونے کے پیر پہنایں جلالی ادھر اس کیلانی پر بھی اور اترا آئی
کبھی ہانکی بھی تھری کبھی چرخن بھی لڑائی کبھی سونے کی ہانکی میں چرخن کی زبان
اُسے اک مستقل دیوار نہ نکلت بنا ڈالا

ذرا سی بات کو افسانہ فطرت بنا ڈالا
حرین وہ لب ہو گئی وہ ہندو آخر کتنی حلاوت کتنے سجھے سے رہی قاصر
وہ کبھی نہ دیکھی کو وہ وقت نشا نوش ہو جانا سراپا چھوٹتا یا سراپا ہوش ہو جاتا
خیال کشی میں جام کی صورت ہو جاتا اقی کا رنگ بھی بدلے دم دم دبوٹتا
کہان بہ حظ ایہ قص کی ہنگامہ آرائی کہان فانی وق شوق کی اب کار فرمائی
شیل پر گنہ گروہ گری گل سے جدا ہو کر
نماشہ بنگلی ہر اک کا گلشن میں فنا ہو کر

”دیر نہ کرے“ یہ نگاہ جاکھ کو دیکھا ہر چہ جو خبر کو ہوا پانی جگہ سکھتا
دیکھا جاسکا ایسا تاملے تھیرا کہ کتنے کی خبر تھامی تھیں حشر کا
گرا گل ہو کر خود بھی رین عشق افسانہ کہ جسے جاویدی جہانہ کیف نکلت پر
ہوئی نکمیل لفت طبع رنگ تہا کی کہ جس میں گئی باتی پھر نہان پیدا کی

وہ حیدر اولین تھی عاشقی حاس فطرت کی

نکاح واپسین یہ طلب کاو محبت کی !!

آخر سے گونج اٹھی ہندو گلشن و محرا صدائے توش زنگی ہر ساز سے پیدا
نغمہ نگین ہو گئی شبنم سے شام شبنم کی ستارہ کی فلک پر ہو گئی انوار سامانی
تقوہ ہو گیا پیدا ہر حسن فطرت میں تلاطم آگیا امواج دریا طافنت میں
سہلے نیلگون پروانہ نکلا جہد حیرت کہ دیکھے اک شہید آرزو کی ہنوز عزت

مگر فطرت نے فوراً صورت عالم بدل ڈالی

نشاط رنگ میں تاریکی ماتم بدل ڈالی

کجوردن کے شہر گویا ہے اشجار و زانی محیط نور میں دلی ہمار رنگ ستانی
زمین پر چاندنی مہر چل رہی نگین چھائیں نشاط خواب کی عنایان ”نثار پر زمین
گھر شبنم نہ بے لطف آسا ہوا گلشن بنا ہر بھول تیر جلال حسن کا فخرن
خار و دم سا چھانے گا ارباب فطرت پر کرن مثاب کی قضا کی اعلیٰ نکلت پر
جسے دیکھا وہ آسودہ نظر آیا تلاطم میں

خوشی کی طرح پوشیدہ اسرار تسلیم میں

کہان کس کہان وہ تیر سیستان فطرت میں عوض میں ان حسن عشق تھے قمر خلوت میں
فضا اسرو لفت تھی ہوا ہو نکلت تھی زمین سے لٹک لٹکتی ہی طافنت تھا
جگر میں جش حشر کا تو دل میں سخت جراتی لب پر مہر جرت تھی نگہ میں کیت سامانی
کوئی سوورنگٹ ہو کوئی شہر ادا کوئی کوئی تیاہ بنو شہر کوئی کوئی حوجفا کوئی
ہلا کی جاذبیت تھی کسی حاس فطرت میں

مگر بھر دی گئی تھیں بھلیان جام لطافت میں

نیا عشق میں حاس کی نگینا قائم ہمار حسن خلق آرا میں بے پروا ایمان قائم
دور ہر ہوش میں کہ بھیت شیں سکون آزا فراق حسن بن نہان شہانے جنون افزا
خیال وصل ایسی تہا کے مرگ خاموشی لالہ ہمار ایسی تہا کے درو جانسوزی
غرض دل سیتوں میں نہان نہان کی دلکی فضا عشق کو ہوئی نہیں کچھ فکر حاصل کی

محبت کا ہر اک جلوہ جواب حسن فطرت ہے

یہی وہ بھول چھپین لطافت ہی لطافت ہے

حافظ غازی پوری

پیام

جز ”سعی دوام“ اور کیا ہے شاعر کا پیام اور کیا ہے
یعنی اس سیکڑے کی رونق جز ”گردش جام“ اور کیا ہے
انسان کا کام اور کیا ہے

ہتے ہوئے آب زندگی پر کچھ نقش اثر بنائے جانا
مٹے ہوئے داغ آرزو کو چمکا کے مہربانائے جانا
قطر وں کو گہر بنائے جانا
کوشش میں ہے راز نظم سستی جنبش ہے دلیل زندگانی
اسے ننگ وجود آدمی زار پانی میں اگر نہ ہو روانی
پانی کو کیسے کون پانی

ہنگامہ سوز و ساز کیوں ہو دل کو اگر آرزو چھوڑے
ساحل کی ہوا بند ہی ہوئی ہے طوفان سے لڑ رہے ہیں بڑے
کھاتے ہیں موج کے چھوڑے
فطرت کا ”سکون مضطرب“ دیکھ ساری چیزیں جھل رہی ہیں
بادل ہیں منتشر فضا میں موجیں کروٹ بدل رہی ہیں
سرگرم عمل ہیں جل رہی ہیں

سرگرم عمل ہو اے صحرا ”طوفان بکنار“ جل رہی ہے
محنت کش ماہ و سال دنیا بالیل و نہار“ جل رہی ہے
جوائے قرار“ جل رہی ہے

ہستی کا نظام ہے ”سلسل“ تنگیں میں زندگی نہیں ہے
منزل کا وجود ہے خیالی منزل کہیں شوق کی نہیں ہے
فطرت کبھی رُو کتی نہیں ہے

وہ نخل جو کل تھا تخم ناجیز وہ غنچہ جو پھول ہو گیا ہے
وہ قطرہ جو تاج قیصری میں موتی بن کر چمکا رہا ہے
صورت گرازا ارتقا ہے

اس بزمِ عمل میں صرف انسان بے خود ہے خراب رنگ لبہ ہے
ہونے کو ہے دل میں آرزو بھی لیکن رسوائے آرزو ہے
بیکانہ راز جستجو ہے
جڑ کھلتی ہے ”نخل آشیان“ کی فکر ”تغیر آشیان“ ہے
گلشن کی بارگاہ رہی ہے گلچین پہ گمان باغبان ہے
مسموم ہوائے گلستان ہے

اے مست مے خیال شاعر اٹھ اور نویدار تقادے
اک نالہ حشر آفرین چھیڑ اے عجاوین سخنور می کھادے
قسمت کو جھنجھوڑ کر کھادے
جو شوق کہ بجھ گیا ہے دلیں اس شوق کو ”گر ملی تڑوے“
محرور نہ ہو جان میں کوئی ہر سب کو شاہ گہر دے
ہر داغ کو ”خانہ جگر“ دے

سرکاکے ”حجاب دے سنی فطرت کو قہیے نقاب کر دے
پردہ انوں کا سوز دے گس کو ہر ذرے کو آفتاب کر دے
اک محشر انقلاب کر دے

جمیل منظری کاظمی

وکتوریہ میموریل کلکتہ میں چند زندہ تصویریں دیکھ کر

حسین چہرون سے رنگین نقاب ٹھائے ہوئے!
خرام ناز پرستانہ لغز شون کا ہجوم!
سیہ نقاب میں شاداب و نازنین چہرے
گھٹیری زلفون کے سایہ میں عارضون کی بہار
سیہ نقابوں میں روشن شفق منسا رخسار
برخ صبح پہ گیسوے مشکبو کا ہجوم!
فضائے کامل مشکین میں شعلہ گون چہرے!
زبان حافظ و خیام میں تکلم ریز!
بھلا چکی جنھیں صدیوں سے سرزمین عجم!
ہراک ادا عجیت کے رنگ سے سرمست!

نگاہ یاس کو اذین کلام دیتی جاؤ!
مسافرانِ حنین کا سلام لیتی جاؤ!

اختر شیرانی

غزلِ افسرِ امروہوی

اے سیلِ اشکِ خون کو بھی ساتھ لے نکل
سایہ کی آفتاب کے پہلو میں جا نہیں
امید ہو کے یاس مگر عارضی نہ ہو
کاش ان کو اعتماد نہ ہو میری چاہ پر
ہم خاک ہو کے بھی نہ ہوئے مائلِ زمین
جب اٹھ چکے تھے ارضِ سما کے عجائب سب
اے اضطرابِ ہجر نہ کھو آبروئے عشق

آنکھوں میں کچھ تو زخمِ جگر کا نشان رہے
یار جب ان کا قرب ہوا ہم کمان رہے
جو چیز میرے دل میں رہے جاودان رہے
جی چاہتا ہے کشمکشِ امتحان رہے
جب تک بھی رہ سکے طرقتِ آسمان رہے
تم میری چشمِ شوق سے کیوں کر نہاں رہے
تا حدِ اختیار نہ آتش نہاں رہے

لکھی تھی یہ نصیب آخر نصیب میں
پیری کے دکھ اٹھانے کو افسرِ جوان رہے

غزل صغریٰ و دہیانوی

خود اپنے دردِ دل کا مداوا کرے کوئی
دار و رسن ہے آگ ہے زندان ہے تلخ ہر
بجور ہو کے اُن کی غلامی قبول کی
مد ہوش ہن کلیم بھی تابِ جمال سے
موقوف ہے جو اُن کی ملاقاتِ حشر پر
مایوسِ دل میں تابِ شکیلِ سقدِ رکمان
زیرِ فلک نہیں کسی شے کو بھی جب قرار
آمین فروش سے غمِ الفت خرید لین
آک نئے حرم کی بنا ڈالئے یہاں
آر بطنِ حسن و عشق سے دنیا کو گھیر لین
ہمراہ پھر چین میں وہ جنتِ فریب ہے
یہ دیکھنا نہیں جو سراپا نظر نہیں
افسانہٴ جمیل ابھی یا دے نظر

محلِ غبارِ راہ سے پیدا کرے کوئی
اب وقت ہے کہ تیری تمنا کرے کوئی
جب دل ہی دے نہ ساتھ تو پھر کیا کرے کوئی
کیا اعتبارِ دیدہٴ بینا کرے کوئی
مقصد یہ ہے نہ روزِ تقاضا کرے کوئی
ایسا نہ ہو کہ آپ کو رسوا کرے کوئی
کیا آرزوئے دولتِ دنیا کرے کوئی
کب تک شکایتِ غمِ دنیا کرے کوئی
کب تک تمیزِ دہرو کلیسا کرے کوئی
آخر کمانِ تلکِ انھین رسوا کرے کوئی
پھر اہتمامِ ساغرِ دینا کرے کوئی
آئینہٴ بن کے آپ کو دیکھا کرے کوئی
کس آسے پہ عشق کا دعویٰ کرے کوئی

غزل شاقب جالندہری

یہ چاہتی ہن انکی بیگانہ دارِ ادائیں
تو بہ ضرورت کی ہے لیکن یہ سوچتا ہوں
امیدِ زندگی کا تھین آخری سہارا
وحشی کو چھیڑتے ہن۔ وحشی کو چھیڑتی ہن
مایوسیوں میں ڈوبیں تاکامیوں کو ابھیں
دل تنگ آگیا ہے اب نامرادیوں سے

دل ہکو بھول جائے ہم دل کو بھول جائیں
کیا چاہتی ہن مجھ سے چھائی ہوئی گھٹائیں
ٹھکرائی جا چلی ہن جو میری التجائیں
اٹھتے ہوئے بگولے چلتی ہوئی ہوائیں
اک کشمکش کی دنیا رکھتی ہن اتجائیں
آسے خیالِ دلبہر تجو گئے لگا نہیں

گم کردہ راہِ شاقب ہم عمر ہر رہینگے
ہاں بخودی ہن شاید منزل کو دیکھ جائیں

براعیات

اللہ نے اعجاز یہ تم کو ہی دیا ناکام محبت کا بھرم کھو ہی دیا
کیا جانے کیوں مجھ کو سر محفل ناز تم ہنس ہی دیئے دیکھ کے میں دیہی یا

اے دکھنے ہوئے دل کے دکھانے والے روتے ہوئے کو بان رولانے والے
اتنا نہیں کرتے ہیں کسی کو بیتاب جھٹکتے ہوئے منہ پھیر کے جانے والے

اٹھ اٹھ کے جھکی نگاہ جانان کسی ہوتی تھی ابھرا بھر کے پنہان کسی
نوارہ خون کا حال سپنے میں نہ پوچھ دل پر چلتی ہی ہیں چھریاں کیسی

اے دوست بتا ترا تکلم کیا ہے جشک کیا ہے ترا تیسم کیا ہے
اسوقت خضابے ایک سحر لرزان آگے ترے مجھ کو یہ تو ہم کیا ہے

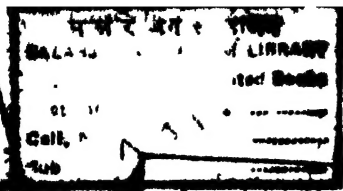
ہاں درد جگر کو کچھ تو اچھا کر لیں ہاں سوز درون کو کچھ تو ٹھنڈا کر لیں
رو لیں ترا نام لیکے شام ہجران دکھتے ہوئے دل کا کچھ مداد کر لیں

فراق گور کھپوری

چھپ کر پیار ہے گنوارہ تمدن

مولانا نیاز فتح پوری کی وہ بے مثل تصنیف جس میں، تاریخ و تمدن، علم و ادب اور اساطیر کی مدد سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی صرف عورت کی ممنون ہے۔ اس کا دیباچہ، مقدمہ اور تتمہ بلحاظ زور و انشا، و حسن بیان و دیکھنے کی چیز ہے یہ کتاب حکومت نظام اور صوبہ متحدہ میں لائبریریوں کے لئے اور اعلیٰ کتب میں منظور ہو چکی ہے قیمت علاوہ موصولہ دو روپیہ (۲۰) منیجر نگار لکھنؤ

[illegible]



شہاب کی سرگزشت

شہاب کی سرگزشت کا وہ عظیم الشان سفرنامہ جو اردو
زبان میں پہلی بار اردو قلمی فن کے کھلے
کھانچا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی عقل اس کی
جوہریت بیان اس کی جلدی مغفوت اور اس کی
انشاء عالیہ سحر محال کے درجے تک پہنچی ہے
یقیناً علامہ محمول ڈاک
ایک رپیس (۱۰)

صحابیات

جس میں محدثات کی ۸۵
خواتین کے متذکرہ حالات بیان کیے
گئے ہیں۔ اس کا مقصد جو کچھ بتانے
کا اصل غرض انشاء میں اس قدر روشن و
قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ مسئلہ نسائیت کے
بہت سے نکات اس سے حل ہو جاتے ہیں
یقیناً علامہ محمول
۱۰

شعر کا انجام

شہاب کی سرگزشت کا کھانا ہوا
جس میں پانچویں بیان، علامہ ہوا، قدرت
مخلوق و مبدع کے بیچ کے تعلقات پر غور و
تعمق کی بولی تصنیف نہیں مل سکتی۔
حسن و معنی کی تمام قسم کی کیفیات اسے
ایک ایک جو میں موجود ہیں۔
یقیناً علامہ محمول دس آنے ۱۰

فرست الید

مولانا نیاز فتح پوری جس کے علاوہ سے ایک شخص
آسانی بات کی شناخت اور اس کی کمیوں کو
دیکھ کر اپنے یادوں سے شخص کے مستقبل، سیرت
علاقہ و ذوال سورت و مہاجات صحت و بیماری
شہرت و دنیاوی و دنیوی کے تعلق صحیح طور پر
پیشین گوئی کر سکتا ہے۔
یقیناً علامہ محمول ۱۰

تاریخ الدین

عربی زبان میں مشہور تاریخ کی تاریخ
جو عربی زبان میں ایک حد درجہ سیرت
تاریخ اسلامی کے ایک حد درجہ سیرت
موجودہ دینی و ملی کی سیاسی تاریخ پر
پیش قدمی و سیرت کے تعلق صحیح طور پر
پیشین گوئی کر سکتا ہے۔
یقیناً علامہ محمول ۱۰

جذبات بھاشا

ہندی شاعری کی علامت
و شیرینی تمام دنیا کی شاعری
ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔
نظم کی ایک پہلی سند کے ساتھ جو
ہندی شاعری کی تاریخ و سیرت کے تعلق صحیح طور پر
پیشین گوئی کر سکتا ہے۔
یقیناً علامہ محمول بارہ آنے ۱۰

گزارہ خندہ گل

علامہ مولوی عبداللہ کی آکاہی کا
۳۰۰ سے زائد اردو قلمی کے علاوہ
کے حالات و سیرت کے علاوہ و قوافل
ماہی کی بات کا نام کے علاوہ
اپنے و غرضی کے علاوہ
پیشین گوئی کر سکتا ہے۔
یقیناً علامہ محمول ۱۰

گوارہ تمدن

اردو سرائیکی (مولانا نیاز کی)
سیرت و سیرت کا نام کے علاوہ
اساطیر کے تعلق صحیح طور پر
پیشین گوئی کر سکتا ہے۔
یقیناً علامہ محمول ۱۰

نظارستان

اردو سرائیکی (نور علی کے) میں حضرت نیاز
کے علاوہ سیرت و سیرت کا نام کے علاوہ
اساطیر کے تعلق صحیح طور پر
پیشین گوئی کر سکتا ہے۔
یقیناً علامہ محمول ۱۰

(سیرت و سیرت کا نام کے علاوہ)

